
ماضی کے طلسم کدے سے حیرت انگیز تاریخی داستان
فصیلِ خوں

آج بھی اس کا دل بہت بے قرار تھا۔ وہ اسی لیے اپنی حویلی سے نکل کر مندر کی طرف چل دیا۔ یہ حقیقت تھی کہ مندر میں پہنچ کر جب تک وہ مندر کے اندر رہتا تھا اس کے دل کو قرار رہتا تھا۔ مندر میں داخل ہو کر اسے یوں لگتا جیسے ہندو مذہب کی تعلیمات پر دل سے یقین آگیا' لیکن مندر سے باہر آتے ہی اس کی کیفیت بدل جاتی۔ اس کے ذہن میں پھر وہی سوال پیدا ہونے لگتے جو اسے بے چین کر دیتے۔ بہت سارے دیوتاؤں کا وجود اسے کھٹکنے لگتا۔ یہ تمام دیوتا اپنے اپنے اندر الگ الگ صفات اور قوتیں رکھتے تھے۔ یہ دیوتا اور ان کی قوتیں آپس میں برسرپیکار رہتی تھیں۔ ان میں کوئی خیر کا دیوتا تھا' تو کوئی شر کا' کوئی پانی برساتا تھا' تو کوئی رزق دیتا تھا۔ ان دیوتاؤں کی پیکار میں اسے اپنا وجود ریزہ ریزہ ہو کر بکھرتا دکھائی دیتا۔ اسے شدت سے یہ احساس ہوتا کہ وہ زیادہ عرصے یہ کرب نہیں جھیل پائے گا۔ جب یہ کرب حد سے سوا ہو جاتا تو مجبوراً" وہ مندر کا رخ کرتا۔ اسے خود بھی حیرت تھی کہ اس کے بے قرار دل کو مندر میں کیوں قرار آجاتا ہے! اپنی اس کیفیت کا اظہار اس نے اپنی بیوی کے سوا کسی

سے نہیں کیا تھا کیونکہ اسے اپنے معزز اور شریف راجپوت خاندان کی رسوائی کا خوف تھا۔ اس کا خاندان راجپوتوں میں عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ لوگ اس کے خاندان کی شرافت اور بہادری کو دل سے تسلیم کرتے تھے۔ بظاہر وہ اپنے بزرگوں کے مذہب پر قائم تھا' لیکن اس کے اندر جو شکست و ریخت ہو رہی تھی' کوئی بھی پوری طرح اس سے آگاہ نہیں تھا۔ اس وقت بھی اس کے وجود میں یہی شکست و ریخت ہو رہی تھی کہ گھبرا کر اپنی حویلی سے نکل کھڑا ہوا تھا۔ ابھی وہ اپنی حویلی سے زیادہ دور نہیں گیا تھا کہ اسے ایک نوجوان نظر آیا جو اسی کی طرف دوڑا چلا آرہا تھا۔ اس کے قدم رک گئے۔ اس نے نوجوان کو پہچان لیا تھا۔ وہ نوجوان اس کے پڑوس ہی میں رہتا تھا۔ وہ اس طرح بھاگتا ہوا آرہا تھا جیسے کوئی بلا اس کے تعاقب میں ہو۔

قریب آتے ہی اس نے نوجوان کو روک لیا اور پوچھا۔ "تم اتنے بد حواس ہو کر کیوں بھاگ رہے ہو شرزہ خاں! کیابات ہے؟"

نوجوان کے چہرے سے خوف دہشت کا اظہار ہو رہا تھا۔ اس نے اپنے پھولے ہوئے سانس پر قابو پا کر بمشکل بتایا۔

"کسی نے ٹیکری والے درویش کو قتل کر دیا ہے۔ اس کی لاش کے ٹکڑے راستے میں بکھرے ہوئے ہیں"

اس نے یہ وہشت ناک خبر سنی' مگر نوجوان شرزہ خاں کی بات پر اسے کچھ یقین نہ آیا اور بولا۔

"اچھا میں دیکھتا ہوں۔"

"تم جاؤ" یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا۔

اگر واقعی ایسا ہی تھا جیسا کہ شرزہ خاں نے بتایا تھا تو یہ بڑے فتنے کی بات تھی۔ اگرچہ اس محلے میں اکثریت ہندوؤں کی تھی اور مسلمانوں کے صرف چند گھر تھے' پھر بھی ٹیکری والے درویش کا قتل کوئی ہنگامہ برپا کر سکتا تھا۔ وہ یہی سوچتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔

اسی محلے کے آخر میں ایک ٹیکری تھی جہاں وہ درویش ایک جھونپڑی میں رہتا تھا۔ عموماً" وہ ٹیکری سے نیچے نہیں اترتا تھا۔ کبھی کبھار ہی اسے محلے کے گلی کوچوں میں دیکھا گیا تھا۔ ٹیکری پر رہنے کی وجہ سے لوگوں نے اس کا نام "ٹیکری والا درویش" رکھ دیا تھا۔ وہ بھی اس درویش کو کئی بار دیکھ چکا تھا۔ درویش کسی سے کچھ نہیں کہتا تھا' اپنی ہی دھن میں مست رہتا تھا۔ اس درویش سے کسی کو کوئی پرخاش نہیں ہو سکتی تھی۔

شام کا وقت تھا اور یوں بھی یہ کوئی عام گزر گاہ نہیں تھی اس لیے راستے میں اسے کوئی نظر نہیں آیا۔ وہ کچھ دور ہی اور چلا ہو گا کہ ٹھٹک کر رک گیا۔ کچھ ہی فاصلے پر ایک کٹا ہوا سر راستے میں پڑا تھا۔ سفید داڑھی کے بال خون میں لتھڑے ہوئے تھے۔ اس نے درویش کے کٹے ہوئے سر کو دور ہی سے پہچان لیا۔ وہ آگے بڑھا اور پھر شرزہ خاں کے بقیہ بیان کی بھی تصدیق ہو گئی۔ ٹیکری والے درویش کی لاش کے ٹکڑے راستے میں دور تک بکھرے ہوئے تھے۔ وہ ان کے قریب سے گزرا چلا گیا۔

یہ پہلا موقع تھا کہ مندر میں بھی اس کا جی نہیں بہلا۔ وہ اس لیے پوجا کر کے جلد ہی مندر سے باہر آگیا۔

مندر سے نکل کر اپنی حویلی تک پہنچنے کیلئے اسے پھر اسی راستے سے گزرنا تھا۔ ابھی تک اس کے ذہن سے درویش کا خیال نہیں نکلا تھا۔ درویش کا چہرہ اس کی آنکھوں میں گھوم رہا تھا۔

وہ لوٹ کر اس جگہ پہنچا جہاں اس نے درویش کی لاش کے ٹکڑے دیکھے تھے تو حیران رہ گیا۔ لاش غائب تھی۔ اس کے پیروں میں جیسے کسی نے زنجیر ڈال دی۔ وہ حیرت سے آس پاس نگاہ دوڑانے لگا۔

"وہاں ہمیں کہاں ڈھونڈ رہا ہے! ہم یہاں ہیں"

اسے اپنے عقب سے ایک بھاری آواز سنائی دی۔

آواز سنتے ہی وہ فوراً" مڑا۔ پھر اسے جو کچھ نظر آیا' وہ اس کے لئے

ناقابل یقین تھا۔ ٹیکری والا درویش اس کے سامنے زندہ و سلامت کھڑا تھا اور اس کے ہونٹوں پر بڑی پراسرار سی مسکراہٹ تھی۔

"آج ہم دکن کے گلی کوچے چھوڑ کر جا رہے ہیں"۔

درویش کہہ رہا تھا۔

"اب ہمیں کہیں اور کا حکم مل گیا ہے۔ اب ہم ادھر کبھی نہیں آئیں گے مگر اے راؤ جے راج تجھے ہم سیدھی راہ دکھا جائیں گے۔ تیرے اندر جو پیکار جاری ہے، ہمیں خبر ہے۔ بول تجھے پناہ چاہئے؟"

"ہاں..... ہاں!" وہ بڑی مشکل سے کہہ سکا۔

"تجھے کسی ایک ہستی کی پناہ چاہئے! تو ایسا کر کہ اس کی پناہ میں چلا جا جس کا کوئی ہم سر نہیں۔ وہ قادر مطلق ہے۔ اس نے جو کتاب اتاری ہے، اسے پڑھ اور غور کر! تجھے پناہ مل جائے گی۔ اور دیکھ وہاں جبر نہیں۔ تیرا دل مانے تو مان نہ مانے تو نہ مان، جا اور وہ کتاب پڑھ! اللہ نے چاہا تو تجھے دیوتاؤں سے نجات مل جائے گی۔ تیرے دل کو قرار آجائیگا۔"

یہ کہتے ہی وہ درویش مڑا اور پھر چند قدم چلتے ہی نظروں سے اوجھل ہوگیا۔

یہ واقعہ ایسا نہ تھا کہ راؤ جے راج پر اس کا اثر نہ ہوتا۔ اس نے درویش کے کہنے پر عمل کیا اور بغیر کسی جبر کے اپنی مرضی و خواہش سے مسلمان ہوگیا۔ اب اس کا نام راؤ جے راج کی بجائے راؤ عبدالرزاق تھا۔ اس کی بیوی نے دیکھا کہ شوہر مسلمان ہوگیا ہے تو وہ بھی ایمان لے آئی، مگر حویلی میں ایک تیسری ہستی اور بھی تھی۔ یہ ان کی گیارہ سالہ بیٹی ساوتری تھی۔ ساوتری عام بچوں سے قطعی مختلف اور خداداد ذہانت کی مالک تھی۔ اس کے ماں باپ مسلمان ہوگئے تو وہ سخت پریشان ہوگئی۔

کئی دن تک جب ساوتری بجھی بجھی اور خاموش خاموش سی رہی تو اس کے ماں باپ اس کی طرف سے فکر مند ہوگئے۔ عبدالرزاق کو درویش کے

الفاظ یاد آئے۔ دین اور عقائد کے معاملے میں وہ خود بھی جبر کا قائل نہیں تھا۔ یہی حال اس کی بیوی کا بھی تھا۔ وہ دونوں اسی وجہ سے اپنی بیٹی پر کوئی جبر کرنا نہیں چاہتے تھے۔ ان کی بیٹی ہونہار اور ذی شعور تھی۔

ساوتری کو پریشان دیکھ کر ایک دن راؤ عبدالرزاق اس سے نہایت شفقت کے ساتھ بولا۔

"ساوتری! تم ہرگز کچھ خیال نہ کرو۔ ہم کبھی تم پر جبر نہیں کریں گے کہ مسلمان ہو جاؤ تم اپنی طبیعت کی مختار ہو، چاہے ہندو مذہب پر رہو، چاہے مسلمان ہو جاؤ۔ ہم تمہیں تمہارے خیالات میں پابند کرنا نہیں چاہتے اور نہ تمہیں کسی بات پر مجبور کریں گے"۔

ساوتری کی ماں نے بھی اس سے ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا۔

ساوتری اپنے والدین کی باتیں سن کر خوش ہوگئی اور اس کا رنج و ملال ختم ہوگیا۔ پھر اس نے مکمل دو سال تک پوری توجہ اور لگن سے اپنے آبائی دین اور اسلام کا مطالعہ کیا۔ اس مطالعے کا یہ نتیجہ ہوا کہ وہ بھی تیرہ برس کی عمر میں مسلمان ہوگئی۔ راؤ عبدالرزاق اور اس کی بیوی دونوں ہی اپنی بیٹی کے مسلمان ہونے سے بہت خوش ہوئے۔ اس کا بڑا سبب یہ تھا کہ ان کی بیٹی امتہ الحبیب کسی جبر یا طمع کے خیال سے مسلمان نہیں ہوئی تھی بلکہ اس نے خود مطالعہ کرکے اور سوچ سمجھ کر اسلام قبول کیا تھا۔ عبدالرزاق اسے پیار میں بانو کہتا تھا اور پھر اس کا نام بانو بیگم ہی ہوگیا۔

ہندوؤں اور خصوصاً راجپوتوں کے طبقہ امراء میں اس وقت بھی بڑی کھلبلی مچی تھی جب راؤ جے راج مسلمان ہوا تھا۔ اب امتہ الحبیب کے بارے میں جان کر وہ اور بھی جھنجلائے۔ برہمنوں نے یہ جاننے کے باوجود کہ دکن پر مسلمانوں کی حکومت ہے اور دکن کا حکمران ابوالحسن تاناشاہ ان پر سختی بھی کر سکتا ہے، انہوں نے بڑا زہر اگلا۔ تاناشاہ کی حکومت میں ہندوؤں کو پوری مذہبی آزادی حاصل تھی۔ ابوالحسن تاناشاہ جو عبداللہ قطب شاہ کے بعد حکمران ہوا

تھا ہمیشہ نرمی اور درگزر سے کام لیتا تھا۔ سو اس موقع پر بھی اس نے ایسا ہی کیا۔ امتہ الحبیب کی شہرت کا باعث یہ تھا کہ اس نے کم عمری کے باوجود اور بغیر جبر خود مطالعہ کرکے اسلام قبول کیا تھا۔ تانا شاہ کے محل تک بھی اس کی شہرت پہنچ گئی۔ محل کی خواتین اسے دیکھنے اور اس سے ملنے کی بہت مشتاق تھیں۔ بالآخر تانا شاہ نے عبد الرزاق اور امتہ الحبیب کو بلا بھیجا۔ یوں ایوان حکومت تک امتہ الحبیب کی رسائی ہوگئی جسے اب عبد الرزاق کے علاوہ دوسرے مسلمان بھی احترام کے ساتھ بانو بیگم کہنے لگے تھے۔

ابو الحسن تانا شاہ بھی بانو کی ذہانت و لیاقت سے بہت متاثر ہوا اور بانو کو اپنی منہ بولی بیٹی بنا لیا۔ اپنی فطری لیاقت اور جودت ذہن کی بدولت بانو نے سب کے دل جیت لیے تھے۔ کچھ ہی روز کے بعد اس کا زیادہ تر وقت محل میں گزرنے لگا تھا۔ شہزادے اور شہزادیاں اس کی علمی فیاضیوں کے باعث اسے دل سے چاہتے تھے۔

بانو نے محل کے علمی ماحول سے پورا فائدہ اٹھایا اور تحصیل علم میں وہ حیرت انگیز و نمایاں ترقی کی کہ اگر گھر میں تعلیم دی جاتی تو شاید اتنی ترقی نہ کرسکتی۔

بانو کا کوئی بھائی نہیں تھا اس لیے رزاق کو کمال امنگ اور شوق تھا کہ وہ اپنی دلی آرزوؤں کو بانو سے پورا کرے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بانو کو مردانہ لباس پہنوایا کرتا تھا۔ لڑکوں ہی کی طرح بانو نے علمی اور سپاہیانہ تعلیم حاصل کرنے کا آغاز کیا۔ پہلے اس نے شہسواری سیکھی' پھر تیر اندازی کی تعلیم حاصل کی۔ غرض کہ جس قدر فنون سپہ گری کے تھے' وہ سب بانو نے بہت جلد اپنے مہربان باپ کی کوشش سے حاصل کرلیے۔ وہ بہت تھوڑے عرصے میں جنگ کے تمام فنون سیکھ گئی اور اپنے ہم عصر نوجوانوں میں امتیازی نظروں سے دیکھی جانے لگی۔ چھ سات سال کے عرصے میں اس کا رنگ روپ بھی نکھر آیا تھا۔ سرخ و سفید رنگ اور مردوں ایسا چہرہ ہونے کے باوجود اس میں صنف مخالف

کے لیے بلا کی کشش تھی۔ اس نے اپنے استادوں سے آواز بدل کر بولنے کا فن بھی سیکھا تھا۔ کوئی بھی اجنبی اسے مردانہ لباس میں دیکھ کر اور اس کی بدلی ہوئی مردانہ آواز سن کر یہ اندازہ نہیں لگا سکتا تھا۔ کہ وہ عورت ہے۔

ابو الحسن تانا شاہ سے خصوصی قربت کے سبب راؤ عبدالرزاق بھی اب اس کی فوج میں ایک اچھے عہدے پر فائز ہوگیا تھا۔ اپنے باپ کو دیکھ کر بانو کو بھی سپہ گری کا اشتیاق پیدا ہوا اور اپنے باپ سے اس نے خواہش کا اظہار کیا۔ راؤ عبدالرزاق نے اسے بہت سمجھایا مگر وہ ضد پر اڑی رہی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اس سلسلے میں خود تانا شاہ سے بات کرے گی۔ پھر ایک روز اس نے موقع پا کر تانا شاہ کی خدمت میں اپنی درخواست پیش کر ہی دی۔ ابو الحسن تانا شاہ اس حسین و جمیل نوجوان لڑکی کا عزم دیکھ کر حیران رہ گیا۔

"یہ بڑی کٹھن راہ ہے میری بچی!"

تانا شاہ نے محبت سے کہا۔ "تم ایسی نو خیز لڑکی کو میں فوج میں بھرتی ہونے کی اجازت نہیں دے سکتا"

بانو کب اتنی آسانی سے ہار ماننے والی تھی۔ اس نے دلائل سے قطب شاہی حکمراں کو قائل کرنا چاہا اور بولی۔

"میں عورت ہونے کی حیثیت سے نازک بھی ہوں اور فولاد کی طرح سخت بھی۔"

تانا شاہ کو ابھی تک یہ علم نہیں تھا کہ بانو اپنی آواز بدلنے پر بھی قادر ہو چکی ہے۔ اس نے اسی لیے تانا شاہ سے مزید کہا۔

"میں مردانہ لباس پہن کر اور مردانہ آواز میں گفتگو کرکے کسی کو یہ احساس نہ ہونے دوں گی کہ میں ایک عورت ہوں"

پھر اس نے تانا شاہ کے روبرو اپنی اس صلاحیت کا اظہار بھی کیا جس سے تانا شاہ متاثر ہوا۔

"یہ تو ٹھیک ہے مگر تم مردوں کے شانہ بہ شانہ لڑ سکوگی مجھے اس کا

یقین نہیں" تاناشاہ فکر مند لہجے میں بولا۔

"حضور امتحان لے سکتے ہیں۔"

بانو بولی۔ "مجھے دعوی تو نہیں مگر اتنا ضرور عرض کروں گی کہ اعلیٰ حضرت کو مایوسی نہیں ہوگی۔"

یہ کہہ کر بانو نے عربی زبان کا ایک شعر پڑا۔ اس شعر کا مطلب یہ تھا

"میں نے آگ کو اپنا غلام بنا لیا اور وہ میرے بدن میں لہو بن کے دوڑنے لگی۔ میں نے فولاد کو موم بنا کر اپنے سینے میں رکھ لیا اور وہ میرے پہلو میں دھڑکنے لگا"۔

شعر سن کر تاناشاہ نے تعریف کی اور پھر دریافت کیا۔

"یہ کس کا شعر ہے؟"

اس سوال کے جواب میں جب بانو نے اسے بتایا کہ وہ خود اسی کا شعر ہے تو تاناشاہ اور بھی خوش ہوا۔ تاناشاہ کے استفسار پر بانو نے اسے یہ بھی بتایا کہ وہ عربی کے علاوہ ترکی زبان میں بھی شعر موزوں کرتی ہے اور فارسی میں بھی۔ تاناشاہ اس کی خداداد ذہانت اور صلاحیت کا معترف تو ہوگیا مگر اب بھی اسے یقین نہیں تھا کہ بانو سپاہیانہ زندگی گزار سکتی ہے۔ اور کسی مرد کے مقابل جم سکتی ہے۔ یہی سوچ کر اس نے گویا فیصلہ سنایا۔

"کل سر دربار ہم تمہارا امتحان لیں گے"

دوسرے دن بانو اپنے باپ سپہ دار عبدالرزاق کے ساتھ مردانہ لباس پہن کر اور ہتھیاروں سے لیس ہو کر دربار میں پہنچی۔ اس کے جسم پر جو زرہ تھی' وہ خود اسی نے بنائی تھی۔ راؤ عبدالرزاق کے چہرے سے فکر مندی کا اظہار ہو رہا تھا۔ اسے علم ہو چکا تھا کہ بانو کا مقابلہ کس سے ہوگا۔ یہی اس کی فکر مندی کا سبب تھا۔

راؤ عبدالرزاق اس نوجوان کو بچپن ہی سے جانتا تھا جس کا مقابلہ بانو کو کرنا تھا۔ وہ نوجوان گڑھی سیٹرم کے قلعہ دار کا بیٹا شرزہ خاں تھا۔

قلعہ دار نے بچپن ہی سے اپنے بیٹے کی بہترین تربیت کی تھی اور وہ فن شمشیرزنی میں طاق تھا۔

شرزہ خاں کی حویلی اس کی حویلی سے زیادہ دور نہیں تھی۔ یہ وہی شرزہ خاں تھا جس نے ٹیکری والے درویش کے قتل کی خبر دی تھی۔ شرزہ خاں اور بانو دونوں ہی بچپن سے ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے تھے۔ بانو اسے پسند نہیں کرتی تھی کیونکہ وہ بہت مغرور اور شیخی خورہ تھا۔ شرزہ خاں کی ناک طوطے کی چونچ کے مانند خم کھائی ہوئی اور جبڑے بھاری تھے۔ اس کی الوؤں کی سی چھوٹی چھوٹی گول آنکھوں میں بڑی چمک تھی۔ ان آنکھوں میں ہر وقت ہوس ناچتی رہتی تھی۔ شرزہ خاں نے محلے کی دوسری نوجوان لڑکیوں کی طرح بانو پر بھی ڈورے ڈالنا چاہے تھے۔ مگر بانو اس سے بڑی سرد مہری کے پیش آئی تھی۔ پھر شرزہ خاں کی ہمت نہ ہوئی تھی کیونکہ اسے علم تھا کہ بانو کی رسائی محل تک ہے۔ اوباش ہونے کے باوجود شرزہ خاں اپنے جسم اور صحت کا بہت خیال رکھتا تھا۔ اس کا جسم ٹھوس اور گٹھیلا تھا۔ اس کی وجہ بہترین خوراک تھی۔ شمشیرزنی اس کی گھٹی میں پڑی تھی پھر تربیت نے اسے اور بھی نکھار دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بہت جلد ابوالحسن تاناشاہ کی فوج میں کمان دار کے عہدے تک پہنچ گیا تھا۔ اس کا طریقہ جنگ اس کی فطرت کا آئینہ دار تھا وہ اپنے حریف کو فریب دیکر مارنے میں فخر محسوس کرتا تھا۔

آخر وہ گھڑی آہی گئی جب ابوالحسن تاناشاہ نے مقابلے کا اعلان کیا۔ ان دونوں کے مقابلے کے لیے پہلے ہی سے جگہ بنائی گئی تھی جو تخت شاہی سے ذرا فاصلے پر تھی' مگر اتنی دور بھی نہیں کہ تاناشاہ ان کے جوہر نہ دیکھ پاتا۔

اس وقت جب بانو کے مقابل آنے والے نوجوان شرزہ خاں کے نام کا اعلان کیا جا رہا تھا تو عبدالرزاق کی نگاہ اپنی بیٹی کے چہرے پر تھی۔ یہ اعلان سن کر بانو کے چہرے پر لمحہ بھر کو حیرت تو ضرور نظر آئی تھی مگر خوف کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ وہ اپنے باپ عبدالرزاق کے سامنے جھکی اور اجازت طلب

کی۔

عبدالرزاق نے اپنی چہیتی بیٹی کے سر پر ہاتھ رکھا اور دعا دی۔

"خدا تجھے فتح یاب کرے"۔

اعلان ہوتے ہی شرزہ خاں مقررہ جگہ پہنچ چکا تھا۔ وہ اپنی عادت کے مطابق سینہ تانے شیخی سے کھڑا تھا۔ جب بانو اس کی طرف بڑھی تو اس کے ہونٹوں پر حقارت آمیز سی مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔ چند لمحوں بعد ہی دونوں ایک دوسرے کے مقابل کھڑے ہوئے۔ لوگ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ بانو کے پاس ڈھال نہیں تھی۔

مقابلہ شروع ہونے سے پہلے ابو الحسن تانا شاہ نے اس بات کو محسوس کر لیا اور بہ آواز بلند بانو کو مخاطب کیا۔

"تو ڈھال بھی ہاتھ میں لے لے کہ تیرے حریف کے پاس بھی ڈھال ہے"۔

یہ سن کر بانو نے جواب دیا۔

"مجھے ڈھال کی ضرورت نہیں کہ میری تلوار ہی میری ڈھال ہے شاہ عالی وقار مجھے ڈھال کے بغیر لڑنے کی اجازت فرمائیں"

تانا شاہ نے کہا

"اگر تو اسی پر بضد ہے تو میں اسے تیری نادانی ہی کہوں گا اس طرح تو مقابلہ شروع ہونے سے پہلے ہی نصف لڑائی ہار جائے گی ہم تجھ سے پھر کہتے ہیں کہ اپنے اس خیال سے باز آجا اور ڈھال کے بغیر نہ لڑ! حریف تجھ پر فوقیت حاصل کر لے گا۔"

اس پر بھی بانو نے یہی درخواست کی کہ مجھے ڈھال کے بغیر لڑنے کی اجازت دی جائے ..... تانا شاہ نے جبر کی راہ اختیار نہ کی اور بانو کی درخواست قبول کر لی پھر چند لمحے بعد ہی تانا شاہ کا ہاتھ بلند ہوا اسی کے ساتھ بانو اور شرزہ خاں اپنی اپنی تلواریں سونت کر ایک دوسرے کے مقابل آگئے۔

شرزہ خاں نے بانو کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں بانو نے بھی نگاہ نہ ہٹائی اور اسے گھورتی رہی یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ دونوں لڑنے سے پہلے ایک دوسرے کی طاقت کا اندازہ لگا رہے ہوں پھر شرزہ خاں کسی زہریلے سانپ کی طرح پھنکارا۔

"تو ایک عورت ہے' خدا کی کمزور مخلوق! مجھے مرد ہو کر یہ زیب نہیں دیتا کہ اپنے ہاتھ میں ڈھال رکھوں ... تو اگر اپنے نازک اور حسین جسم پر میری تلوار سے نقش و نگار بنوانا نہیں چاہتی تو لے میری ڈھال سنبھال لے میں تیرے مقابل ڈھال کے بغیر بھی لڑ سکتا ہوں"

یہ کہ کر اس نے بانو کی طرف ڈھال بڑھائی۔

"دور رکھو اسے"

بانو نے اسے ڈانٹ دیا' پھر کہا "غازی گفتار نہ بن' غازی میدان بن! حیلوں اور بہانوں سے اس وقت کو دور نہ کر جب تیرا سر ندامت سے جھکا ہو"

یہ سن کر شرزہ خاں کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا اور اس نے اپنے ہاتھ سے ڈھال پھینک دی' پھر چیخا۔

"تو پھر سنبھل!"

اسی کے ساتھ اس نے وار کیا۔ بانو نے اچھل کر اس کا وار خالی دیا۔ شیرزہ خان کی تلوار اس کے دونوں پیروں کے نیچے سے گزر گئی تھی یہ اچھا موقع تھا کہ وہ شرزہ خاں پر حملہ کر دیتی' مگر اس نے دوبار بھی شرزہ خاں ہی کو حملے کا موقع دیا کافی دیر تک وہ شرزہ خاں کے خطرناک حملوں سے بچتی رہی اور خود اس پر تلوار نہیں اٹھائی۔ دربار "مرحبا' مرحبا" کی صداؤں سے گونجتا رہا یہ صدائیں شرزہ خاں کو اور طیش دلاتی رہیں۔

ابو الحسن تانا شاہ اور راؤ عبدالرزاق دونوں ہی منتظر تھے کہ بانو حملہ آور ہو' مگر وہ اب تک اس طرح لڑ رہی تھی جیسے وار نہ کرنے کا فیصلہ کر چکی ہو اب تک اس نے شرزہ خاں کی تلوار کا کوئی وار اپنی تلوار پر بھی نہیں روکا تھا

دیکھنے والوں نے ایسی لڑائی پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی انہیں یوں لگ رہا تھا جیسے ان کے سامنے بجلی سی کوند رہی ہو۔ بانو کے پاؤں جیسے زمین پر نہیں تھے وہ گھڑی میں ادھر اور گھڑی میں ادھر نظر آتی اس کی تیزی اور مستعدی قابل دید تھی اس کے جسم میں اتنا لوچ ہونا کسی مرد کے جسم میں ممکن نہیں وہ جو مختلف مراحل میں بانو کے استاد رہ چکے تھے' ان کے سینے فخر سے پھولے ہوئے تھے۔ بانو اس وجہ سے بھی کسی ایک جگہ نہیں ٹک رہی تھی کہ شرزہ خاں کے حملوں میں بڑی شدت تھی اب تک شرزہ خاں کی تلوار بانو کے جسم کو نہ چھو سکی تھی اور یہ اس کے لیے شرم کی بات تھی۔ شرزہ خاں کے ایک خطرناک وار سے بچتے ہوئے بانو نے بلند آواز میں اسے مخاطب کیا۔

"شرزہ خاں! میں تمہیں مہلت دوں گی کہ تم اپنی ڈھال اٹھالو کیونکہ اب میری تلوار بلند ہوگی تمہارے اندر اتنی ہمت' طاقت اور حوصلہ نہیں کہ ڈھال کے بغیر میرے حملوں سے بچ سکو"۔

شرزہ خاں طیش کے عالم میں چیخ کر بولا "میں ڈھال نہیں اٹھاؤں گا' تو وار کر!۔"

"مگر میں تجھے ڈھال اٹھانے پر مجبور کروں گی!" بانو نے کہا اور پھر اس کی تلوار بلند ہوئی۔



شرزہ خاں نے بانو کا پہلا وار اپنی تلوار پر روکا اور اس کا سارا جسم جھنجھنا اٹھا ضرب بہت شدید تھی اگر وہ فوراً ہی تیزی سے پیچھے نہ ہٹ جاتا تو تلوار اس کے ہاتھ سے گر جاتی یوں بھی وہ اب خاصا تھک گیا تھا اور بانو تازہ دم نظر آتی تھی۔ شرزہ خاں کے پیچھے ہٹتے ہی بانو پھر اس پر جھپٹی اس کی تلوار کا وار روکتے ہوئے شرزہ خاں سنبھلنے کی کوشش میں لڑکھڑایا اور پھر زمین پر گر گیا۔ بانو نے اسے اٹھنے کا موقع نہیں دیا۔ شرزہ خاں نے اس کا وار پھر اپنی تلوار پر روکا' لیکن اس بار بانو نے مزید وار کرنے کی بجائے تلوار پر اپنے جسم کا بوجھ ڈال دیا۔ شرزہ خاں زمین پر چت پڑا تھا اور بانو دائیں جانب گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھی ہوئی اپنی تلوار پر دباؤ ڈال رہی تھی۔ شرزہ خاں کی تلوار لمحہ بہ لمحہ نیچے ہوتی جا رہی تھی مقابلے سے پہلے جن شرائط کا اعلان کیا گیا تھا' ان میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ دونوں فریقوں کو شکست قبول کرکے اپنی زندگی بچانے کا حق حاصل ہے۔ شرزہ خاں اس شرط سے فائدہ اٹھا کر اپنی زندگی بچا سکتا تھا مگر اس نے ایسا نہیں کیا اس کی بجائے شرزہ خاں نے بانو سے ان لمحوں میں ایک ایسی

بات کہی جسے مضحکہ خیز ہی کہا جاسکتا ہے وہ بانو سے بولا۔

”سن اگر تو میرے خوابوں کی تعبیر بننے پر آمادہ ہو جائے تو میں اپنی شکست قبول کرنے پر راضی ہوں“

بانو نے اسے حقارت کی نظر سے دیکھا اور بولی۔

”لعنت ہو تیری ہوس پر! مگر میں تجھے ابھی اور ذلیل کروں گی“ یہ کہتے ہوئے اس نے خلاف توقع نہایت تیزی سے اپنی تلوار شرزہ خاں کی تلوار پر سے ہٹالی اور ایک دم اچھل کر کھڑی ہو گئی سبھی یہ دیکھ کر ششدر رہ گئے بانو نے دانستہ شرزہ خاں کی جاں بخشی کی تھی۔ شرزہ خاں کے لیے اتنا موقع کافی تھا وہ تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا مگر اٹھتے ہی اسے سنبھلنے کی مہلت نہ مل سکی بانو اس پر پے در پے وار کر رہی تھی اور وہ پیچھے ہٹتا جا رہا تھا اب وہ اس جگہ تک پہنچ چکا تھا جہاں اس کی ڈھال پڑی ہوئی تھی۔

”ڈھال اٹھالے! میں تجھے مہلت دیتی ہوں ورنہ تیرا جسم زخموں سے بھر جائے گا۔“

بانو نے اپنا ہاتھ روک کر شرزہ خاں سے کہا۔

شرزہ خاں نے قریب ہی زمین پر پڑی ہوئی ڈھال اٹھانے کی بجائے اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہا مگر بانو غافل نہیں تھی وہ تیزی سے جھک گئی اگر اسے لمحے بھر کو بھی دیر ہو جاتی تو اس کا سرتن سے جدا ہو جاتا۔

”دیکھ میں تجھے آخری بار موقع دے رہی ہوں ورنہ پھر مجبور ہو جاؤں گی“ بانو نے تیزی سے دور ہٹتے ہوئے کہا۔

یہ بات اب کسی سے چھپی نہ رہی تھی کہ بانو رعایت سے کام لے رہی ہے، مگر کچھ دیر بعد ہی لوگوں نے شرزہ خاں کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلتے سنی۔ بانو کی تلوار کی نوک نے اس کے بائیں بازو پر گہرا چرکا لگایا تھا۔ شرزہ خاں کی بائیں آستین پھٹ گئی اور بازو برہنہ ہو گیا۔ چند ہی لمحے بعد بانو نے پھر اسی زخمی بازو کو نشانہ بنایا اور اسی کے ساتھ ایک ایسی بھرپور ضرب لگائی کہ اس

ضرب سے بچنے اور اسے روکنے کی خاطر شرزہ خاں کو جھک جانا پڑا اسی وقت اس کی پنڈلی پر بھرپور ٹھوکر پڑی اور وہ زمین پر گر پڑا تلوار اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی مجبوراً“ اسے بانو کے حملے سے بچنے کے لیے ڈھال اٹھانا پڑی اس نے بانو کا وار ڈھال پر روکا اور لیٹے لیٹے ہی قریب پڑی ہوئی تلوار کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ بانو نے ٹھوکر مار کر اس کی تلوار دور پھینک دی۔ مقابلہ اس وقت تک جاری رہنا تھا جب تک ان دونوں میں سے کوئی ایک شکست قبول نہ کر لیتا۔ مگر معلوم یہ ہو رہا تھا کہ شکست کی ذلت برداشت کرنے کی بجائے شرزہ خاں اپنی جان دیدے گا۔ بانو اب اس سے یوں کھیل رہی تھی جیسے بلی چوہے سے کھیلتی ہے اس نے شرزہ خاں کو اٹھ کر کھڑے ہونے کا موقع تو دیدیا تھا مگر زمین پر پڑی ہوئی تلوار نہیں اٹھانے دی تھی۔

شرزہ خاں کا جسم خون اور پسینے میں بھیگا ہوا تھا اور سانس بھی بے قابو تھا۔ بانو اسے آرام کا موقع نہیں دے رہی تھی کچھ دیر بعد لوگوں نے اس حیرت انگیز لڑائی کا ایک اور ناقابل یقین منظر دیکھا اور ان کے سانس جیسے رک گئے سارے دربار پر سناٹا چھا گیا۔ بانو نے ایسا ہی خطرناک قدم اٹھایا تھا اس نے اپنی تلوار شرزہ خاں کی طرف اچھال دی تھی جسے شرزہ خاں نے لپک لیا تھا اب وہ شرزہ خاں سے کچھ فاصلے پر نہتی کھڑی ہوئی تھی نہ اس کے ہاتھ میں ڈھال تھی نہ تلوار!

بانو کا یہ عمل اہل دربار کے خیال میں خودکشی کے مترادف تھا اس وقت لوگوں کے ذہن سے یہ بات نکل ہی گئی تھی کہ مقابلے کے آغاز میں بھی تقریباً“ ایسی ہی صورت حال تھی فرق صرف یہ تھا کہ اس وقت تلوار ہاتھ میں ہونے کے باوجود بانو نے اسے استعمال نہیں کیا تھا اور اب تلوار ہاتھ میں نہ تھی کسی نہتے پر حملہ کرنا بہادروں کے نزدیک بزدلی ہے اور بانو اپنے حریف شرزہ خاں کو بزدل ہی ثابت کرنا چاہتی تھی۔ تلوار ہاتھ میں آتے ہی شرزہ خاں میں جیسے نئی زندگی آگئی وہ بانو کی طرف دیکھ کر چیخا۔

"اب میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا!" غصے کے عالم میں شرزہ خاں کو آداب دربار کا بھی ہوش نہیں رہا تھا۔

میر دربار نے اس نازیبا حرکت پر شرزہ خاں کو جھڑکا ابو الحسن تانا شاہ کو اس وقت اتنا ہوش نہ تھا کہ اس بے ادبی کو محسوس کرتا اس کا سبب بانو سے اس کی جذباتی وابستگی تھی بانو کو اس نے بہرحال اپنی بیٹی بنایا تھا وہ بانو کے فن حرب پر حیران تھا۔ تانا شاہ ہی کیا خود بانو کے باپ راؤ عبدالرزاق کو بھی اندازہ نہ تھا کہ فن حرب میں بانو اس درجہ کامل ہو چکی ہے۔ جب مقابلہ شروع ہونے والا تھا تو تانا شاہ کو یہی گمان تھا کہ کچھ دیر میں بانو اپنی شکست مان لے گی' لیکن اب اس کے جذبات و احساسات قطعی مختلف تھے۔

تانا شاہ نے دیکھا کہ میر دربار کی پھٹکار سننے کے بعد شرزہ خاں لمحے کو ٹھٹکا پھر کسی بد کے ہوئے گھوڑے کی طرح بانو کی طرف لپکا۔ بانو بڑے سکون سے اپنی جگہ کھڑی رہی اس نے ذرا حرکت نہ کی۔ شرزہ خاں تلوار سیدھی کیے جس طرح بانو کی طرف لپکا تھا اسے دیکھ کر ہر شخص با آسانی سمجھ سکتا تھا کہ وہ بانو کو قتل کر دینا چاہتا ہے۔

شرزہ خاں اور بانو میں بہ مشکل ایک نیزے کا فاصلہ رہ گیا تھا کہ بانو انتہائی تیزی کے ساتھ سامنے سے ہٹ کر شرزہ خاں کی بائیں جانب ہو گئی۔ شرزہ خاں اپنے ہی زور میں آگے بڑھتا چلا گیا اور جب وہ بانو کے قریب سے گزرا تو منہ کے بل زمین پر آ رہا۔ بانو نے اس کی دونوں ٹانگوں کے درمیان اپنی ایک ٹانگ پھنسا کر اسے گرا دیا تھا یہ سب کچھ چند لمحوں میں ہو گیا اور کہنیوں میں کافی چوٹیں آئیں وہ کراہتا ہوا اٹھ ہی رہا تھا کہ اسے پھر زمین بوس ہونا پڑا۔ پشت پر پڑنے والی لات کی ضرب اتنی ہی شدید تھی اس بار شرزہ خاں کا ماتھا زمین سے ٹکرایا اور اس کا سر پھٹ گیا اس نے ایک بار زمین سے سر اٹھایا اس کا چہرہ خون میں ڈوبا ہوا تھا اس نے کہنیوں کے بل پھر اٹھنے کی کوشش کی مگر اب اس میں جان نہیں رہی تھی وہ اوندھا زمین پر گر پڑا اور اس کا جسم

بے حرکت ہو گیا اور وہ بے ہوش ہو چکا تھا سارا دربار تحسین و آفرین سے گونج اٹھا۔

○-------○-------○

شرائط کے مطابق بانو یہ خوفناک مقابلہ جیت چکی تھی شرائط میں یہ شرط بھی تھی کہ لڑتے لڑتے دونوں فریقوں میں سے کوئی ہوش کھو بیٹھا تو اسے شکست خوردہ تسلیم کیا جائے گا۔ بانو نے جھک کر شرزہ خاں کے قریب پڑی ہوئی اپنی تلوار اٹھائی اور پھر ابو الحسن تانا شاہ کے تخت کی طرف بڑھی قریب پہنچ کر اس نے تلوار زمین پر رکھ دی' پھر تعظیما" تانا شاہ کے سامنے جھک گئی۔

تاناشاہ جوش جذبات میں اپنے تخت سے اتر آیا' پھر بانو کے قریب پہنچ کر شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور بولا۔

"ہمیں خبر نہیں تھی کہ ہماری بیٹی میں ایسے جوہر چھپے ہوئے ہیں"

یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے گلے سے موتیوں کا ایک ہار اتار کر بانو کو پہنا دیا۔ بادشاہ کی اس عنایت پر بانو ایک بار پھر تعظیم میں جھکی اور بادشاہ کی عطاء پر شکر گزاری کا اظہار کیا۔

اس دوران میں میر دربار کے حکم پر سپاہی زخمی اور بے ہوش شرزہ خان کو وہاں سے اٹھا کر لے جا چکے تھے۔

اس واقعہ کے دوسرے ہی روز ابو الحسن تانا شاہ نے بانو کو اپنی فوج میں کماندار کا عہدہ دیدیا اور وہ اس نئی ذمہ داری کے معاملات سے نمٹنے میں مصروف ہوگئی۔

چند روز بعد شرزہ خاں جسمانی طور پر تو صحت مند ہوگیا مگر اس کی روح بیمار ہی رہی بانو سے شرمناک شکست کھانے کے بعد اب اس کا حیدر آباد میں مزید رہنا دو بھر ہوگیا تھا اس نے ابو الحسن شاہ سے درخواست کی کہ اسے اس کے باپ کے پاس گڑھی سیٹرم جانے کی اجازت دیدی جائے یہ علاقے پہلے مغل تاجدار شہنشاہ عالمگیر کے زیر نگیں تھے مگر تانا شاہ نے ایک موقع سے فائدہ اٹھا کر اسے قطب شاہی سلطنت میں شامل کر لیا تھا۔ شرزہ خاں کی درخواست بادشاہ نے قبول کرلی۔

جس دن شرزہ خاں کو گڑھی سیٹرم جانے کی اجازت ملی' اس کے دوسرے ہی دن سر شام وہ حیدر آباد سے گڑھی سیٹرم کی طرف روانہ ہوگیا اس کے ہمراہ اس کی دونوں جوان اور حسین بیویاں بھی تھیں ان میں سے ایک بے اولاد تھی اور دوسری چند ماہ بعد ماں بننے والی تھی۔

حیدر آباد سے تقریبا دس بارہ فرسخ نکل آنے کے بعد ہی شرزہ خاں نے پڑاؤ ڈالنے کا حکم دیدیا مناسب جگہ دیکھ کر خیمے لگا دیئے گئے شرزہ خاں نے اپنا خیمہ الگ نصب کرایا دونوں بیویوں کے خیمے دائیں بائیں تھے یہ پہلا موقع تھا کہ سفر کے دوران میں اس نے ایسا کیا تھا اس کی بڑی بیوی نسترن کو یہ شاق گزرا نسترن حسین تھی اور اسے اپنے حسن پر ناز تھا شرزہ خاں بھی اسے پسند کرتا تھا جب دور مے چلتا تو شرزہ خاں اسی کو اپنا ساقی بناتا' مگر سفر میں وہ کبھی شراب کو ہاتھ نہیں لگاتا تھا یہ بھی نئی بات تھی کہ اس شب شرزہ خاں نے اپنا یہ اصول توڑ دیا نسترن بڑی مشکل سے اس کے خیمے میں آنے پر آمادہ ہوئی جب رات کا ایک پہر گزر گیا تو شرزہ خاں نے نسترن سے اس کے خیمے میں جانے کو کہا۔

نسترن ایک ادا سے بولی۔

"ہم تو نہیں جائیں گے ہم تنہا نہیں رہیں گے اس خیمے میں"

شرزہ خاں یہ سن کر بگڑ گیا۔

"بے وقوف عورت! ضد نہ کر میں نے تیرے لیے الگ خیمہ لگوایا ہے تو اس کا کوئی سبب ہے۔"

نسترن بہ دستور اٹھلاتی رہی۔

"تو بتا دو نا سبب! کیا یہاں تمہارے خیمے میں آج رات کوئی اور چاند اترنے والا ہے۔"

یہ کہتے ہوئے وہ کہنی کے بل مسند پر نیم دراز ہو گئی۔

شرزہ خاں اس حرکت پر اور بھی چراغ پا ہو گیا اور تقریباً چیخ اٹھا۔

"اٹھ جا یہاں سے ورنہ میں تجھے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا تیرے خیمے تک لے جاؤں گا"

آخر نسترن کو وہاں سے جانا پڑا اس کے پھول ایسے رخسار پر شرزہ خاں کی انگلیوں کے نشان تھے اور آنکھوں میں آنسو....

نسترن چلی گئی تو شرزہ خاں اپنے خیمے سے نکلا۔ خیمے کے در پر دو سپاہی پہرا دے رہے تھے انہیں میں سے ایک شرزہ خاں کو دیکھتے ہی ایک طرف لپک گیا۔ شرزہ خاں دوبارہ خیمے میں چلا گیا اور اپنی کمر سے تلوار باندھنے لگا خنجر اس کے پٹکے میں پہلی ہی موجود تھا جب وہ دوبارہ خیمے سے نکلا تو خیمے کے در پر ایک سپاہی گھوڑے کی باگ تھامے کھڑا ہوا تھا یہ وہی سپاہی تھا جو اسے پہلی بار دیکھ کر اس خیمے کی طرف لپک گیا تھا جس میں قافلے کے بہترین گھوڑے باندھے گئے تھے۔ شرزہ خاں بغیر کچھ کہے گھوڑے پر سوار ہو گیا۔

اس کا گھوڑا تیزی سے حیدر آباد کی طرف اڑا جا رہا تھا اسے یقین تھا کہ صبح کا اجالا پھیلنے سے پہلے وہ دوبارہ اپنے پڑاؤ تک واپس پہنچ جائے گا۔ حیدر آباد کی حدود میں داخل ہونے سے پہلے وہ اپنے چہرے کو ایک سیاہ نقاب میں

چھپا چکا تھا دیر تک اندھیرے میں سفر کرنے کے سبب ہر چند کہ اس کی آنکھیں تاریکی سے مانوس ہو گئی تھیں مگر اس کے باوجود عبدالرزاق کی حویلی اسے دور سے نظر نہ آسکی اس کی منزل وہی حویلی تھی سارے راستے اس کے جانے پہچانے تھے اس لیے اسے حویلی کے عقبی دروازے تک پہنچنے میں کوئی دشواری نہ ہوئی اپنے گھوڑے کو اس نے عقبی دروازے سے کچھ فاصلے پر ایک پیڑ سے باندھ دیا گھوڑا وہاں اندھیرے میں تنہا باندھے جانے پر احتجاجی انداز میں ہنہنانے لگا تو شرزہ خاں نے اسے تھپکا اور وہ مانوس لمس پا کر خاموش ہو گیا۔

ہر طرف سناٹا اور تاریکی تھی حویلی بھی تاریک پڑی تھی یوں لگتا تھا جیسے وہاں کوئی نہ رہتا ہو شرزہ خاں نے محتاط انداز میں عقبی دروازے کی طرف قدم بڑھائے اور پھر دروازے کے سامنے پہنچ کر ہی رکا چند لمحے وہ سن گن لیتا رہا پھر دروازے پر تین بار وقفے وقفے سے دستک دی توقع کے مطابق اسے فوراً ہی جواب مل گیا۔

"کون؟"

دروازے کی دوسری جانب سے مدھم سی آواز ابھری۔

شرزہ خاں نے بلا تامل جواب دیا۔

"ساتواں سوار"

یہ وہ شناختی الفاظ تھے جو خود شرزہ خاں نے طے کئے تھے۔

فوراً ہی دروازہ کھل گیا اور شرزہ خاں اندر داخل ہو گیا دروازے سے متصل ہی پہریدار کی کوٹھری تھی پہریدار کو ساتھ لیے شرزہ خاں اس کوٹھری میں پہنچ گیا۔

"چراغ نہیں جلایا تم نے؟"

شرزہ خاں پست آواز میں بولا۔ شرزہ خاں اس کوٹھری میں اس لیے آیا تھا کہ پہریدار کی مشکیں کس دے تاکہ بعد میں اس پر کوئی الزام نہ آئے۔

پہریدار اس کی بات سن کر عجیب سے لہجے میں اس سے مخاطب ہوا۔

”چراغ اس لیے نہیں جلایا میں نے کہ کہیں تم میری شکل دیکھ کر اپنے حواس نہ کھو بیٹھو“

شرزہ خاں کو اس پر غصہ آگیا اور بولا۔

”کیا بکتا ہے!“ اسی کے ساتھ اس کا ہاتھ تلوار کے قبضے پر پہنچ گیا‘ لیکن اسی وقت اس کی کلائی ایک مضبوط ہاتھ نے اپنی گرفت میں لے لی۔ وہ اپنی کلائی چھڑانے کے لیے جدوجہد کرتے ہوئے بھنایا۔ ”یہ کیا گستاخی ہے!“

”جواب میں شرزہ خاں کو جو آواز سنائی دی‘ اسے سن کر اس کے ہوش اڑ گئے اس سے کہا گیا۔

”گستاخی تو تم نے کی ہے شرزہ خاں! کیا کسی کے گھر میں اس طرح داخل ہونا گستاخی نہیں ہے؟“

”تم .... تم ...... بانو! ..... دھوکا ..... غداری ...... فریب!“

وہ غصے کے عالم میں دانت پیسنے لگا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ بانو اب تک آواز بدل کر بولتی رہی ہے۔

”چراغ روشن کر دو!“

بانو کی آواز پھر ابھری اور اسی کے ساتھ اس نے شرزہ خاں کی کلائی چھوڑ دی۔ اسی وقت شرزہ خاں کو اپنی پشت پر چبھن محسوس ہوئی۔ بانو نے اسے پھر مخاطب کیا۔

”تم جس طرح کھڑے ہو اسی طرح کھڑے رہو! اپنی جگہ سے حرکت نہ کرنا‘ تمہاری پشت پر میری تلوار کی نوک رکھی ہے“

شرزہ خاں جیسے پتھر کا ہو گیا چند ہی لمحے بعد کوٹھری روشن ہو گئی۔

کوٹھری میں اسے اپنے سامنے ہی وہ پہریدار کھڑا ہوا نظر آیا جسے اس نے بطور رشوت ایک قیمتی خنجر دیا تھا۔ اس خنجر کا دستہ خالص سونے کا تھا۔ وہی خنجر اس وقت پہریدار کے ہاتھ میں نظر آ رہا تھا۔

بانو کی آواز چند ساعت بعد پھر شرزہ خاں کو اپنے عقب سے سنائی

ی۔ ”شرزہ خاں! مال وزر سے انسانوں کی وفاداریاں نہیں خریدی جا سکتیں۔ اس کے لیے ان کے دل جیتے جاتے ہیں۔ مجھے تمہاری سازش کا علم اسی دن ہو گیا تھا جب تم نے میرے اس نمک خوار کو یہ خنجر دیا تھا۔ اب اگر یہی خنجر تمہارے سینے میں پیوست کر دیا جائے تو کیسا رہے! میں تمہاری چال کو تم ہی پر الٹ دوں گی۔ کوئی بھی تمہارے قتل کا شبہہ مجھ پر نہ کر سکے گا۔

”نہیں“!

شرزہ خاں بے اختیار خوف زدہ سی آواز میں چیخ اٹھا۔

بانو نے اسے ڈانٹ دیا۔

”آہستہ بولو‘ میں نہیں چاہتی کہ میرے والد کے آرام میں خلل پڑے ورنہ تمہیں اوپر اپنے کمرے تک آنے دیتی“

چند لمحے توقف کے بعد اس نے پہریدار کو حکم دیا۔

”شرزہ خاں کو غیر مسلح کر دو!“

اسی کے ساتھ اس نے شرزہ خاں کو دھمکی دی

”تم ذرا بھی ہلے تو تمہارا کام تمام کر دیا جائے گا“

پہریدار حکم کی تعمیل میں آگے بڑھا۔ شرزہ خاں بے بس ہو چکا تھا اس لیے کچھ بھی نہ کر سکا۔ پہریدار نے اس کی نیام سے تلوار نکال لی اور پٹکے سے خنجر بھی کھینچ لیا۔ پھر وہ پیچھے ہٹ گیا۔

بانو پہریدار سے مخاطب ہوئی۔ اب یوں کرو کہ اس رسی سے اس کی مشکیں کس دو جس سے یہ تمہیں باندھنے والا تھا۔ وہ رسی اس کی جیب ہی میں ہو گی۔ ان الفاظ کے ساتھ ہی وہ شرزہ خاں کے سامنے آ گئی اور اس نے اپنی تلوار کی نوک شرزہ خاں کے سینے پر رکھ دی۔

پہریدار قریب آ گیا تو بانو ذرا سی پیچھے ہٹ گئی۔ پہریدار نے شرزہ خاں کی جیب سے ریشم کی باریک سی ڈوری کا لچھا نکال لیا اور پھر انتہائی تیزی کے ساتھ شرزہ خاں کے دونوں ہاتھ اس کی پشت پر باندھ دیئے۔

شرزہ خاں نے عجیب سی نظروں سے بانو کی طرف دیکھا اور بولا۔

"کیا تم مجھے واقعی قتل کر دو گی؟ اگر قتل ہی کرنا مقصود ہے تو پھر ہاتھ پاؤں باندھنے کی کیا ضرورت ہے"

بانو مسکرائی اور کہا "کسی کو تڑپا تڑپا کر مارنے میں جو مزہ ہے' وہ یونہی مار دینے میں کہاں! تم نے میرے قتل کا سامان کیا تھا۔ ہر اعتبار سے یہ بڑا سنگین جرم ہے۔ میں چاہتی تو اس جرم میں تمہیں دار پر چڑھا دیا جاتا' مگر تم میرے مجرم ہو۔ میں خود ہی تمہیں سزا دینا چاہتی ہوں۔"

اس دوران میں پہریدار شرزہ خاں کی مشکیں کس کر اسے زمین پر ڈال چکا تھا اور سر جھکائے ایک طرف کھڑا تھا۔

شرزہ خاں اوپر سے جتنی شیخی بگھارتا تھا' اندر سے اتنا ہی بزدل تھا۔ اپنی موت کو قریب دیکھ کر وہ رونے لگا۔ کچھ اثر اس کے دماغ پر شراب کا بھی تھا ورنہ وہ اتنی جلدی بدحواس نہ ہو جاتا۔

بانو اس کے قریب آ گئی اور بولی۔

"مرد کی آنکھ میں آنسو بھلے نہیں لگتے۔ تم مرد ہو کر اپنے انجام پر رو رہے ہو"

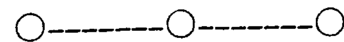
شرزہ خاں گڑگڑانے لگا۔

"مجھے معاف کر دو' خدا اور رسولؐ کے واسطے معاف کر دو! میں اپنے خدا کو حاضر و ناظر جان کر عہد کرتا ہوں کہ اب اپنے دل میں تم سے کوئی کدورت نہیں رکھوں گا۔"

بانو زور سے ہنس دی اور شرزہ خاں کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ بانو کی ہنسی میں اسے ایسی ہی سفاکی کی نظر آئی تھی۔ پھر جب بانو بولی تو اسے یقین ہو گیا کہ بانو اس کا جرم معاف نہیں کرے گی۔

بانو نے کہا تھا۔

"تمہیں ابھی سے معاف کر دوں! ابھی تو میں نے تمہارے بدگوشت پر چرکے لگا کر نمک بھی نہیں چھڑکا شرزہ خاں!"



اس شخص کے چہرے پر خوف و دہشت کے سائے پھیلے ہوئے تھے جو بانو کو قتل کرنے آیا تھا۔ ایک بار پھر وہ بانو کے سامنے گڑگڑانے لگا۔ بانو سے وہ اپنی زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا اور قسمیں کھا کر وعدے کر رہا تھا کہ اب کبھی بانو کے لیے کوئی برا خیال اپنے دل میں نہیں لائیگا۔ یہ وہی شرزہ خاں تھا جس نے اپنی خجالت مٹانے کے لیے بانو کو قتل کرنے کا فیصلہ کیا تھا اس وقت وہ ریشمی ڈوری سے بندھا ہوا بانو کے سامنے قطعی بے بس پڑا تھا۔

بانو کا ارادہ شرزہ خاں کو قتل کرنے کا نہیں تھا۔ شرزہ خاں کو وہ صرف خوفزدہ کرنا چاہتی تھی تاکہ آئندہ وہ کوئی ایسا ارادہ نہ کر سکے۔ بانو اسے کوئی جسمانی اذیت بھی دینا نہیں چاہتی تھی اس کا جو مقصد تھا' پورا ہو چکا تھا۔ اس نے پہریدار کو اشارہ کیا اور بولی۔

"میں نے خدا رسول ﷺ کے نام پر تمہاری جان بخش دی۔ خدا تمہیں تمہارے عہد پر قائم رہنے کی توفیق دے۔"

شرزہ خاں یہ سن کر رقت آمیز آواز میں کہنے لگا۔

"میں تمہارا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا"

پہریدار نے اسے ریشمی ڈوری کی گرفت سے آزاد کر دیا تو بانو کے پر اس کی تلوار اور خنجر بھی واپس کر دیئے۔ شرزہ خاں نے اپنی تلوار نیام ڈال دی اور خنجر بھی پٹکے میں لگا لیا' مگر طلائی دستے والا خنجر بانو کی طرف ب دیا۔

"اسے میرا نذرانہ سمجھ کر قبول کر لو بانو۔"

شرزہ خاں نے کہا۔

"نہیں!"

بانو نے انکار میں سر ہلا دیا۔ "تم یہ خنجر بھی اپنے ساتھ لے جاؤ اسے دیکھ کر مجھے کبھی یہ منحوس رات یاد نہ آئے۔ ہم دونوں کے حق میں بہتر ہے۔" شرزہ خاں کی سمجھ میں بانو کی بات آ گئی۔ اس نے اصرار نہ کیا خاموشی سے چلا گیا۔

اس واقعہ کو ابھی ایک ہی مہینہ ہوا تھا کہ شرزہ خاں کا ایک قاصد کا سربند خط لیکر بانو کے پاس پہنچا۔ بانو نے شرزہ خاں کا خط پڑھا تو اس جسارت پر حیران رہ گئی۔ خط میں اسے شرزہ خاں نے لکھا تھا۔

"اے جان شرزہ خاں! میں اپنی زندگی تمہاری خدمت میں صرف کر دینا چاہتا ہوں۔ تمہیں شاید یقین نہ آئے کہ میرے دل میں بچپن ہی سے تمہاری محبت کا چراغ روشن ہے' مگر افسوس کہ مجھے اس کے اظہار کا موقع نہیں مل سکا۔ ایک بار میں نے شاید اظہار کرنا بھی چاہا تو تم نے اسے میری ہوس سمجھا۔ عورت اور مرد الگ الگ نہیں رہ سکتے۔ دونوں ایک دوسرے کی ضرورت ہیں۔ تم جوان ہو اور حسین بھی! تم بھی بہرحال

ایک عورت ہو تمہیں بھی یقیناً اس ضرورت کا احساس ہو گا۔ میں تمہارے والد محترم کو پیغام بھیجنے سے پہلے تمہاری مرضی جاننا چاہتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ تم مجھ پر احسان ضرور کرو گی۔ تمہارے اقرار کا منتظر...... شرزہ خاں"

بانو کو یہ خط پڑھ کر اتنا غصہ آیا کہ کبھی نہ آیا تھا۔ اس نے قاصد کے سامنے ہی خط کو پرزے پرزے کر دیا۔ قاصد سہم کر پیچھے ہٹ گیا۔ اسی غصے کے عالم میں اس نے شرزہ خاں کو اس کے خط کا جواب لکھا جو انتہائی مختصر مگر جامع تھا جواب میں اس نے صرف ایک فقرہ لکھا تھا۔

"شیرنی' شیروں کے لیے پیدا ہوتی ہے' گیڈروں کے لیے نہیں!"

بانو نے شرزہ خاں کے خط کا جواب تو دیدیا تھا لیکن اب وہ کچھ پریشان رہنے لگی تھی۔ شرزہ خاں نے اپنے خط میں جس ضرورت کا احساس دلایا تھا' یہی ضرورت اس کی پریشانی کا سبب تھی۔ ایسا نہیں تھا کہ اس کا دل جذبات سے یکسر خالی ہو۔ وہ پتھر نہیں' عورت تھی' ایک حسین و خوبرو عورت! اس کے دل میں شاعرانہ گداز تھا مگر وہ اس ضرورت کو پورا کر کے کسی قیدی جانور کی طرح زندگی گزارنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ ہرگز اس پر آمادہ نہیں تھی۔ ہمیشہ کے لیے کسی مرد کی ہو جانے کے بعد عورت کے تمام انسانی حقوق تلف کر دیئے جاتے تھے پھر اسے کبھی آزادی نصیب نہیں ہوتی تھی۔ وہ اپنے اردگرد کے ماحول سے بے خبر نہیں تھی۔ اسے عورت کے مقابل مرد کا احساس برتری کسی طرح قبول نہیں تھا۔ اب تک اس نے مستقبل کے بارے میں اس انداز سے نہیں سوچا تھا اسی لیے وہ اس لگاوٹ دلچسپی کو محسوس نہ کر پائی تھی جو محل کے کئی شہزادوں کو اس سے تھی۔ بانو نے اس مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کیا تو اسے معلوم ہوا کہ کئی شہزادے اس سے وابستگی کی آرزو رکھتے ہیں۔ یہ احساس ہوتے ہی اس نے محل میں اپنی آمدورفت کم کر دی۔

حالات کے پیش نظر بانو نے اپنی دانست میں صحیح قدم ہی اٹھایا تھا مگر اسے یہ خبر نہ تھی کہ اس طرح دبی ہوئی چنگاریاں ایک دم بھڑک اٹھیں گی۔ اب تک بانو کا رویہ مردوں اور عورتوں کے ساتھ مساوی رہا تھا۔ اس رویے میں ذرا سی تبدیلی آگئی تو اسے سبھی نے محسوس کر لیا۔ اب وہ مردوں سے بے حجابانہ گفتگو نہیں کرتی تھی۔ وہ بہر حال ایک عورت ہے' اسے یہ احساس دلا کر شرزہ خاں نے کچھ اچھا نہیں کیا تھا۔

اسی دوران ابو الحسن تانا شاہ نے جنگی مشقوں کا حکم جاری کیا۔ ان مشقوں کا بڑا سبب مغل شہنشاہ اورنگزیب عالمگیر کی طرف سے جنگ کا خطرہ تھا۔ یہ خبریں برابر آرہی تھیں کہ عالمگیر کسی بھی وقت دکن کا رخ کر سکتا اور ایسا کرنے کے لیے اس کے پاس مناسب بہانہ بھی تھا۔ گڑھی سیڈرم کا علاقہ اور دوسرے کئی علاقے پہلے قطب شاہی سلطنت ہی کا حصہ تھے مگر مغلوں نے ان پر قبضہ کر لیا تھا۔ اورنگزیب جب دار اشکوہ سے برسرپیکار تھا تو موقع' غنیمت جان کر تانا شاہ نے یہ علاقے دوبارہ حاصل کر لیے تھے۔ جنگی مشقوں کا مقصد قطب شاہ فوج کو چوکنا اور مستعد رکھنا تھا۔ ان کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ سپاہیوں اور فوجی افسروں کی کارگزاری کا امتحان لیا جا سکے۔ اس سلسلے میں قطب شاہی فوج کے جو دستے ترتیب دیئے گئے' ان میں سے ایک دستے کی سرداری بانو کے سپرد کی گئی۔ اس فرضی جنگ میں کل آٹھ فوجی دستے حصہ لے رہے تھے' چار ایک طرف اور چار دوسری طرف۔

بانو کے ساتھ ہی ایک دستے کی سربراہی اس کا باپ عبد الرزاق کر رہا تھا اور بقیہ دو دستے فوج کے دوسرے بڑے افسروں کے تھے چار مخالف دستوں کی کمان بادشاہ کے چار شہزادوں کے سپرد تھی۔ دوران جنگ میں ایک موقع ایسا آیا کہ عبد الرزاق نے جنگی مصلحت کے پیش نظر بانو کے دستے کو عارضی پسپائی کا حکم دیا۔ عبد الرزاق اپنے دستے کے علاوہ بقیہ تینوں دستوں کی بھی کمان کر رہا تھا۔

بانو کے خیال میں یہ عارضی پسپائی حکمت عملی کے خلاف تھی مگر مجبوراً" اپنے باپ کے حکم پر اسے اپنے سپاہیوں کے ساتھ پسپا ہونا پڑا اس پسپائی سے عبدالرزاق جو فائدہ اٹھانا چاہتا تھا نہ اٹھا پایا۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بانو کا دستہ' مخالف دستوں کے درمیان گھر گیا۔ اس سے پہلے ہونیوالی جنگی مشقوں میں کبھی یہ نہ ہوا تھا کہ بانو نے شکست کھائی ہو' لیکن اس بار معاملہ مختلف نظر آرہا تھا۔ وہ بڑی بے جگری سے لڑتی رہی' مگر دباؤ بڑھتا ہی گیا۔ اسی اثناء میں بانو کو ایک شہزادے کی طرف سے یہ پیغام ملا کہ مغربی سمت میں میرا دستہ ہے۔ تم اپنے سپاہیوں کے ساتھ اس طرف نکل آؤ۔ شہزادے نے اپنے پیغام میں کہا تھا۔

"بانو بیگم! میں تمہیں شکست خوردہ نہیں دیکھنا چاہتا"

اس پیغام کے جواب میں بانو نے کہلوا دیا کہ وہ عزت جو دوسروں کی مرہون منت ہو بے عزتی ہے اور مجھے یہ بے عزتی قبول نہیں۔

اس طرح بانو نے گویا شہزادے کی پیشکش مسترد کر دی پھر بانو کو اس امر پر بے حد حیرت ہوئی کہ باری باری بقیہ تین شہزادوں کی طرف سے بھی ایسی ہی پیشکش ہوئی۔ بانو نے انہیں بھی وہی جواب بھجوایا۔ اس کے بعد وہ اپنی کوششوں سے حریف دستوں کا حصار توڑ کر نکل گئی' مگر جانے کیوں اس کا دل مضطرب ہی رہا۔

جب بادشاہ کی طرف سے فرضی جنگ کے خاتمہ پر اسے انعام و اکرام سے نوازا جا رہا تھا تو اس وقت وہ خوش نہیں تھی۔ رہ رہ کر اسے یہ گمان ہو رہا تھا کہ شاید حریف دستوں کے شہزادوں نے اسے جان بوجھ کر اپنے نرغے سے نکل جانے کا موقع دیا تھا۔ یہ مصنوعی جنگ عبد الرزاق کے دستوں نے جیت لی تھی۔ بادشاہ ابو الحسن نے چاروں جیتنے والے دستوں کے سربراہوں کو بڑی بڑی رقمیں بطور انعام عطا کی تھیں۔ اسی کے ساتھ ان کی بہادری اور جرات کی تعریف کی تھی۔

فرضی جنگ کے دوسرے ہی دن بانو جب بادشاہ کی طلبی پر محل میں گئی اور اس سے مل کر لوٹی تو ایک شہزادے نے اس سے خلوت میں کچھ گفتگو کی خواہش کا اظہار کیا اب سے پہلے بانو کسی مرد سے خلوت میں ملتے ہوئے نہ جھجکی تھی، مگر اس روز وہ کسی قدر پریشان سی ہوگئی۔

"کیا خلوت ضروری ہے؟"

وہ شہزادے سے بولی۔

شہزادے نے اسے خاص نظر سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"ہاں یہ گفتگو برسرعام ممکن نہیں"

بانو کسی قدر جھجکتے ہوئے شہزادے کے ساتھ خلوت میں جانے پر راضی ہوگئی۔ شہزادہ اسے محل کے ایک مخصوص حصہ میں لے آیا۔ محل کا یہ حصہ اسی شہزادے کے لیے مخصوص تھا۔ خلوت میں پہنچتے ہی شہزادے نے اپنی بے قراریوں، اپنی بے تابیوں کا ذکر کیا اور پھر نکاح کی درخواست کی۔

کچھ دیر کے لیے بانو کو سکتہ سا ہوگیا۔ چند لمحے وہ گم صم سی رہی، پھر بولی۔

"آپ کئی بیویوں کے شوہر ہیں۔ آپ کی سبھی بیویوں سے میرے خوشگوار مراسم ہیں۔ میں یہ نہیں چاہتی کہ یہ مراسم ختم ہوں یا کوئی نئی شکل اختیار کریں"

شہزادے نے اظہار عشق کر ہی دیا تھا اور اسی سبب اس کی ہمت بھی بڑھ گئی۔ اس نے اسی لیے ایک اور جرات کی۔ اس نے اچانک بانو کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا۔

"ہرچند کہ ہم کئی بیویوں کے شوہر ہیں مگر ان میں تمہاری مثل کوئی نہیں۔ ہم تمہیں ان سب سے اعلیٰ مرتبہ دیں گے"۔

بانو اب خود پر خاصا قابو پا چکی تھی۔ شہزادے کی بات کے جواب میں اس نے پرسکون آواز میں کہا۔

"خلوت میں کسی نامحرم کا ہاتھ پکڑنا برا ہے۔ اس سے گناہ کی ترغیب ملتی ہے۔ آپ میرا ہاتھ چھوڑ دیجئے!"

شہزادے نے بانو کا ہاتھ نہ چھوڑا بلکہ اس پر اپنی گرفت اور مضبوط کر کے بولا۔

"اے بانو بیگم! اے قرار دل و جاں! ہم نے تمہارا ہاتھ چھوڑنے کو تو نہ پکڑا تھا۔ جب ہم کسی کا ہاتھ تھام لیتے ہیں تو پھر نہیں چھوڑتے کہ یہ آداب محبت کے خلاف ہے۔ ہمارے حال پر رحم کرو! تمہارے بغیر ہم بے سکون ہیں۔"

پانی اب سر سے اونچا ہوتا جا رہا تھا اس لیے بانو نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑالیا اور کہا۔

"گستاخی معاف کیجئے گا، میں اب اجازت چاہتی ہوں۔ اسی کے ساتھ میں آپ سے درخواست کرتی ہوں کہ آئندہ ایسے کلمات زبان پر نہ لائیے گا۔

غصے کے باوجود بانو نے حد ادب سے تجاوز نہیں کیا تھا۔

بانو محل سے نکلی تو اس کے وجود میں ایک طوفان سا برپا تھا۔ اس واقعہ نے اس کے احساسات پر بڑی کاری ضرب لگائی تھی۔ اس کا ذہن کسی بھی طرح یہ قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھا کہ کوئی مرد اس پر حکمرانی کرے۔ عورت اور مرد کے درمیان کوئی امتیازی سلوک اسے گوارا نہ تھا۔ پھر اسی دن اپنی حویلی پہنچ کر اسے اسی نوعیت کی ایک اور ناخوشگوار صورت حال کا سامنا کرنا پڑا۔ چھوٹے شہزادے نے اس کے حصول کی خاطر دوسری راہ اختیار کی تھی۔ اس نے عبدالرزاق کو اپنا پیغام بھیجا تھا۔ وہ بھی بانو کو اپنے عقد میں لینے کا آرزومند تھا۔

بانو کو جب اپنی ماں سے اس بات کا علم ہوا تو اس نے صاف جواب دے دیا۔

عبدالرزاق نے اپنی بیٹی کی طبیعت کا اندازہ کر کے شہزادے کو جواب دیا کہ میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتا چونکہ بہ لحاظ اصول اسلام بانو اپنی شادی کرنے کی آپ مختار ہے۔ میں اس پر جبر نہیں کر سکتا۔ بانو کو اختیار ہے کہ

جہاں چاہے اپنی شادی کرے۔ خود میں اسی میں خوش ہوں۔

اس واضح جواب کے بعد وہ شہزادہ بھی مایوس ہو گیا۔

یہ امر حیرت انگیز ہے کہ حسین نوجوان بانو چوبیس سال کی عمر تک عین شباب' دلی جذبات اور پرجوش ولولوں کا زمانہ ہوتا ہے۔ اپنے ہمعصر فو نوجوانوں میں بڑے رعب' وقار اور تمکنت کے ساتھ رہی۔ کسی کو مجال ہوتی تھی کہ اس کی طرف غلط نظر بھی اٹھا سکے۔ بڑے بڑے جواں مرد اس کے اشاروں پر ناچتے تھے اور اس کی تلوار کا لوہا مانتے تھے۔ اس دوران میں اس کی پاک اور بے لوث طبیعت میں کبھی کوئی نامبارک جوش پیدا نہیں ہوا۔

ان گزرے ہوئے مہ و سال میں ایک نومسلم راجپوت عبدلرزاق ا ذاتی کوشش' ہوشیاری اور عقلمندی کی وجہ سے اس قدر اقتدار و عروج حاصل کر چکا تھا اسے قطب شاہی حکمران ابو الحسن تانا شاہ کے دربار میں ایک ب منصب مل گیا تھا۔ قطب شاہی افواج کا سپہ سالار سید مظفر اب بوڑھا ہو چکا مگر اپنے عہدے پر قائم تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ تانا شاہ کو وہی برسراقتدار ل تھا۔ تانا شاہ اسے تو اس کے عہدے سے ہٹانا نہیں چاہتا تھا مگر عملاً سب کچھ ا نے راؤ عبدالرزاق کے ہاتھ میں دیدیا تھا۔ انہیں برسوں میں شرزہ خاں کو بھ خاصا عروج حاصل ہو چکا تھا۔ اس کے باپ کی موت کے بعد اسے گڑھی سیڑم قلعہ دار بنا دیا گیا تھا۔ اس نے اپنی شیطانی ذہانت کو بروئے کار لا کر کئی مہمیں س کی تھیں اور بادشاہ کی نظر میں چڑھ گیا تھا۔ مغلوں کے زیر نگین بہت سا علا اس نے قطب شاہی حدود مملکت میں شامل کرا دیا تھا۔ تانا شاہ اس پر بہت خو تھا مگر یہ بھول گیا تھا کہ مغلیہ تاجدار اورنگزیب عالمگیر اس سے چراغ پا ہو جا گا۔

بانو اس خطرے کو محسوس کر چکی تھی۔ وہ دبی دبی زبان میں تانا شہ سے کہہ بھی چکی تھی کہ شرزہ خاں اس طرح مغلوں کو دکن کا رخ کرنے کی دعوت دے رہا ہے جو کسی بھی طرح مناسب نہیں۔ اس کے خیال میں قطب

شاہی حکومت مغلوں کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں تھی۔ کوئی اور شخص اگر تانا شاہ سے اس طرح کے خیالات کا اظہار کرتا تو شاید تانا شاہ اسے اس کے منصب سے معزول کر دیتا' مگر وہ اس کی منہ بولی بیٹی بانو تھی اس لیے تانا شاہ نے صرف اتنا ہی کہا۔ "تم فکر نہ کرو بیٹی! اگر مغلوں نے ادھر کا رخ کیا تو انہیں منہ کی کھانا پڑے گی۔ مت بھولو کہ اللہ نے بہت سی قلیل جماعتوں کو اکثریت پر فتح دی ہے۔ تمہارا یہ اندیشہ غلط ہے کہ مغل فوجیں دکن کا رخ کر سکتی ہیں۔

اس وقت بانو خاموش ہو گئی' مگر چند ہی روز بعد مخبروں نے جو خبریں دیں' ان سے بانو کے خدشے کی تصدیق ہو گئی۔

شرزہ خاں نے مغلوں کے زیر تصرف جن علاقوں پر قبضہ کیا تھا' ان پر قبضہ کرنے کے لیے اس نے مرہٹہ فتنہ پرداز سردار سنبھا سے بھی مدد لی تھی۔ شرزہ خاں ہی کے ایماء پر تانا شاہ نے سنبھا کو ایک لاکھ ہون کی امداد دی تھی جو نئے علاقے قطب شاہی حکومت میں شامل کیے گئے تھے' وہاں مرہٹوں نے مسلمانوں پر بڑے ظلم کیے تھے۔ وہاں مرہٹوں نے مسلمانوں پر بڑے ظلم کیے تھے۔ ان علاقوں میں اعلانیہ فسق و فجور ہونے لگا تھا اور شراب نوشی بھی عام ہو گئی تھی۔

یہ ساری خبریں اورنگزیب کو ملیں تو اس نے حیدر آباد کی فتح اور ابوالحسن تانا شاہ کی سرکوبی کا فیصلہ کر لیا۔ پہلے اس نے خان جہاں بہادر کو کلتاش' راجہ رام سنگھ اور دوسرے امراء کے ہمراہ ابو الحسن کے امراء کی سر کوبی اور ان کے قبضے سے مغلوں کے علاقے نکالنے پر مقرر کیا' بعد میں اس مہم پر شہزادہ محمد معظم شاہ عالم کو بھاری لشکر کے ساتھ مامور کیا۔ یہ دونوں لشکر آگے پیچھے دکن کی تسخیر پر روانہ ہو گئے۔

انہی دنوں اورنگزیب نے مرزا محمد کو ایک پیغام لے کر ابو الحسن تانا شاہ کے پاس بھیجا۔ ابو الحسن کو بھیجا جانیوالا پیغام یہ تھا۔

"تمہارے پاس نہایت شفاف اور خوش قطع دو الماس ہیں۔ یہ الماس

دوسرے تحائف اور واجب الادا بقیہ نذرانوں کے ساتھ روانہ کر دو۔"

برسر عام تو اورنگزیب نے یہ پیغام دیا مگر خلوت میں مرزا محمد کو بلا کر کہا۔ "ہم تجھے پتھر کے ان بیکار ٹکڑوں کے لیے دکن نہیں بھیج رہے ہیں کہ ایسے سینکڑوں پتھر ہمارے خزانے میں موجود ہیں۔ ہمیں ان کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ تو اس بہانے وہاں جا کر تانا شاہ کی بداعمالیوں کی تحقیق کرے جن کی اطلاعات ہمیں ملتی رہی ہیں۔ اس کام پر خاص طور پر تجھے بھیجنے کی اصل غرض یہ ہے کہ تو ہمارا جان نثار' خانہ زاد اور مزاج داں ہے۔ ہمیں تجھ سے امید ہے کہ تو دوسروں کی طرح مال و اسباب پر فریفتہ ہو کر اس سے خوشامدانہ بات نہیں کریگا۔

بول کیا ہمارا اندازہ تیرے بارے میں غلط ہے؟"

"اس غلام کی بابت حضور نے جو کچھ بھی فرمایا ہے باعث عزت و افتخار ہے۔ یہ غلام انشاء اللہ اعلی حضرت کی توقعات پر پورا اترے گا۔"

مرزا محمد ادب سے جھک کر بولا۔

اورنگزیب نے اس سے مزید کہا۔

"ہم چاہتے ہیں کہ تو اس کے پاس جانے کے بعد نہایت درشتی اور سختی سے پیش آئے تاکہ جوابا" وہ بھی تیرے ساتھ درشتی اور سخت کلامی کرے۔ اس طرح اس کی گوش مالی اور سرکوبی کے لیے ہمارے ہاتھ ایک حجت آ جائے گی ورنہ یہ خبر پاتے ہی کہ شاہی افواج دکن کا رخ کر چکی ہیں۔ وہ ان علاقوں سے دست بردار ہو جائے گا جن پر مرہٹوں کی مدد سے قابض ہو چکا ہے۔ پھر اس پر فوج کشی کے لیے ہمارے پاس کوئی جواز نہ ہو گا جبکہ ہم اب یہ فیصلہ کر چکے ہیں کہ اس حکومت کو ختم کر کے اس کے تمام علاقے کو فتح کر لیں گے۔ بس تیرا کام یہ ہے کہ جس قدر بھی ممکن ہو تو اس کے ساتھ الجھتا اور بگڑتا رہ! اور بات چیت میں قطعا" اس کے آداب کا خیال نہ کر! تجھے ہم تاکید کرتے ہیں کہ تو اس سے خلا ملا کرنے کی ہرگز کوشش نہ کرنا!"

اسی دوران دکن تک یہ خبریں پہنچ چکی تھیں کہ اورنگزیب نے دو لشکر دکن کی طرف روانہ کر دیئے ہیں۔ ابو الحسن تانا شاہ یہ سن کر فکر مند ہو گیا۔ اس نے اپنے دربار کے خاص خاص منصب داروں کو مشورے کے لیے طلب کر لیا۔ ان دنوں شرزہ خاں بھی دکن آیا ہوا تھا۔ اسے بھی تانا شاہ نے مجلس مشاورت میں طلب کر لیا۔ اسی کے ایماء پر مرہٹہ سردار سنبھا کو بھی دربار میں حاضر ہونے اور مجلس مشاورت میں شرکت کے لیے مدعو کر لیا گیا۔ بانو کو جب اس کا علم ہوا کہ سنبھا کو بھی مدعو کیا گیا ہے تو فکر مند ہو گئی۔ اس کے خیال میں یہ اچھا نہیں ہوا تھا۔ اسے علم تھا کہ مغلیہ تاجدار اور مرہٹوں سے سخت کبیدہ خاطر ہے۔ یوں بھی سنبھا' مشہور فتنہ پرداز شیوا جی کا بیٹا تھا اور اس کا جانشین بھی! شیوا جی مغلیہ حکومت کا باغی تھا۔ اورنگ زیب بھلا اس کے بیٹے سنبھا کو کس طرح برداشت کر لیتا۔ سنبھا سے تانا شاہ کی مصلحت بانو کے خیال میں اورنگزیب کو مزید غصہ دلا سکتی تھی۔ بانو کو یہ معلوم نہیں تھا کہ اورنگ زیب خود دکن پر حملہ کرنے کا بہانہ تلاش کر رہا تھا۔

دوسرے دن مجلس مشاورت منعقد ہوئی تو اس میں سنبھا کے ساتھ دوسرے مرہٹہ سردار بھی تھے۔ اس مجلس میں بانو اور اس کے باپ راؤ عبدالرزاق کو بھی بلایا گیا تھا۔ بانو مردانہ لباس ہی میں تھی۔ تانا شاہ نے اہل مجلس کو صورت حال سے آگاہ کیا اور پھر ان سے مشورہ طلب ہوا۔

سب سے پہلے سنبھا اپنی جگہ سے کھڑا ہوا اور بڑی زہریلی تقریر کی۔ اس تقریر کا لب لباب یہ تھا کہ مغل حکمران غیر ملکی ہیں۔ ان کا ہندوستان پر کوئی حق نہیں۔ ہندوستان محض ہندوستانیوں کا ہے۔ آخر میں وہ بولا کہ اگر مغل فوجوں نے دکن کا رخ کیا تو ان کے دانت کھٹے کر دیئے جائیں گے۔ اسی کے ساتھ اس نے مرہٹوں کی جانب سے تانا شاہ کا بھرپور ساتھ دینے کے علاوہ ایک تجویز بھی پیش کی۔ وہ تجویز یہ تھی کہ قطب شاہی افواج میں اعلیٰ منصبوں پر مرہٹہ سرداروں کو مقرر کیا جائے تاکہ مرہٹے جی جان سے بادشاہ کی حمایت کریں اور مغل حملہ آوروں کا منہ موڑ دیں۔

سنبھا کی تجویز سے شرزہ خاں نے مکمل اتفاق کیا۔ بانو نے محسوس کیا کہ تانا شاہ' مرہٹہ سردار اور شرزہ خاں کی باتوں سے خوش اور مطمئن نظر آ رہا ہے تو وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور کچھ کہنے کی اجازت چاہی۔ بادشاہ نے اسے اجازت دے دی تو اس نے سنبھا اور شرزہ خاں سے واضح طور پر اختلاف کیا۔ اس نے بطور خاص سنبھا کی تجویز کو رد کر دیا اور اس طرح اورنگزیب مزید ناراض ہو جائے گا۔

"ہمیں اس کی خوشی یا ناراضگی کی پرواہ نہیں۔"

سنبھا بول اٹھا۔ "ہم تو صرف یہ جانتے ہیں کہ بادشاہ عالی اور ہمارا دشمن ایک ہے۔ ہمیں اس لیے ایک ہو جانا چاہیے۔"

یہ مجلس مشاورت خاصی دیر تک گرم رہی۔ عبدالرزاق اور دیگر امراء اور نصب داروں نے بھی تقریریں کیں۔ اکثریت اس حق میں تھی کہ مرہٹوں کو اپنا حلیف بنا لیا جائے۔ سنبھا کی یہ دلیل بڑی کارگر ثابت ہوئی تھی کہ

مرہٹوں اور قطب شاہی حکومت کا دشمن ایک ہے اور دشمن سے مل کر مقابلہ کرنا چاہیے۔ خود تانا شاہ بھی اس فیصلے پر پہنچا تھا نتیجتاً سنبھا کو حلیف بنا لیا گیا اور اس کی تجویز بھی قبول کر لی گئی۔ دو مرہٹہ سرداروں اکنا اور مادنا کو اعلیٰ مناصب دے کر صف امرا میں شامل کر لیا گیا تھا۔ بانو، اس کے باپ عبدالرزاق اور چند دیگر امرا کی بات نہیں مانی گئی۔

چند ہی روز بعد اورنگزیب کے سفیر مرزا محمد کے دکن پہنچنے کی اطلاع موصول ہوئی۔ وہ حیدر آباد سے ابھی ایک منزل پر تھا اور جلد تانا شاہ کے دربار میں پہنچنے والا تھا۔ اس موقع پر بانو خلوت میں تانا شاہ سے ملی اور اسے بہ مشکل اس پر آمادہ کر لیا کہ مغلوں کے سفیر سے نرمی اور درگزر کا سلوک کیا جائے۔ اسی کے ساتھ بانو نے یہ مشورہ بھی دیا کہ اگر مصالحت کی کوئی راہ نکل سکے تو اس کے لیے کوشش کی جائے۔ تانا شاہ نے اپنی منہ بولی بیٹی کی خوشنودی کے لیے بہ جبرواکراہ یہ تجویز مان لی حالانکہ وہ دل سے اس پر راضی نہیں تھا۔

جب مرزا محمد دربار قطب شاہی میں حاضر ہوا تو اس وقت بانو بھی وہاں موجود تھی۔ مرزا محمد نے اورنگزیب کی ہدایت کے سامنے جھک کر آداب بجا نہیں لایا۔ اس پر دربار میں موجود مرہٹہ سرداروں کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔

"کیا تجھے نہیں معلوم کہ بادشاہوں کے حضور میں کس طرح حاضر ہوا جاتا ہے؟"

اکنا غرور و نخوت میں ڈوبی ہوئی آواز میں بولا۔

"ہاں میں جانتا ہوں کہ آداب و تسلیمات کا حق صرف اپنے شاہ کے لیے مخصوص سمجھتا ہوں، کسی غیر کے لیے نہیں۔" مرزا محمد بلا خوف بول اٹھا۔

بات بگڑ نہ جائے اس خیال سے تانا شاہ نے ہاتھ کے اشارے سے اکنا کو مزید کچھ کہنے سے روک دیا۔ اسے بانو سے کیا ہوا وعدہ یاد تھا۔ وہ اسی لیے خود مرزا محمد سے مخاطب ہوا۔

"تم کیا پیغام لے کر آئے ہو؟"

ہم منتظر ہیں۔"

مرزا محمد نے اورنگ زیب کا پیغام اسے دے دیا، پھر مطلوبہ الماسوں کی صفات اور وزن بتایا۔

"ایسے الماس ہمارے خزانے میں نہیں ہیں۔" "تانا شاہ کا لہجہ نرم تھا۔" اگر ہوتے تو یقیناً اپنے لیے باعث سعادت جان کر حضور میں بھجوا دیتا۔ اس سے پہلے بھی اعلیٰ حضرت شاہجہاں کے زمانے میں جو الماس کان سے برآمد ہوئے تھے اور بارگاہ شاہی کے قابل تھے، ہمارے خسر محترم عبداللہ قطب الملک نے فرمان جاری ہوئے بغیر ہی بھیج دیئے تھے۔" تانا شاہ نے جو کچھ کہا وہ غلط نہیں تھا۔

تانا شاہ نے مطلوبہ وزن و صفات کے الماسوں سے معذوری ظاہر کرنے کے بعد الماس کے چند تراشیدہ اور ناتراشیدہ بیش بہا پتھر، زمانی یاقوتوں کے ہمراہ جو اس کے پاس نذر کے قابل تھے۔ مرزا محمد کے حوالے کر دیئے۔ مرزا محمد نے منہ بناتے ہوئے یہ نذرانے اورنگ زیب کی طرف سے قبول کر لیے۔ اس موقع پر اسے سفارتی آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے بہ طور شکرانہ تانا شاہ کے سامنے جھک کر آداب بجا لانا چاہیے تھا، مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس بے ادبی پر ایک امیر خلیل اللہ خان نے اسے ٹوکا۔ خلیل اللہ خان شہر حیدر آباد میں موجود متعین سپاہ کا سالار تھا۔ اسے مرزا محمد کی یہ بے ادبی سخت ناگوار ہوئی تھی۔

"آداب شکرانہ بادشاہوں کے حضور پیش کیے جاتے ہیں" مرزا محمد سخت لہجے میں بولا۔

"ہم بھی اس حقیر خطہ ارض کے بادشاہ کہلاتے ہیں۔" تانا شاہ کوشش کے باوجود خاموش نہ رہ سکا۔

"تمہیں اپنے لیے لفظ بادشاہ استعمال نہیں کرنا چاہیے!" مرزا محمد نے بہ دستور سخت لہجے میں کہا۔

بانو نے سوچا کہ یہ بات اورنگ زیب عالمگیر تک پہنچے گی تو زیادہ شکر رنجی کا سبب بن جائے گی۔ وہ اسی خیال سے اٹھی اور تانا شاہ کو مخاطب کیا۔ "اگر حضور اجازت مرحمت فرمائیں تو محترم مرزا محمد کی بات کا جواب میں عرض کر دوں۔"

تانا شاہ نے بانو کی طرف حیرت سے دیکھا اور پھر اجازت دے دی۔

بانو نے مرزا محمد کی طرف دیکھا' پھر نرم لہجے میں بولی۔

"محترم! آپ کا یہ اعتراض غلط ہے۔ اگر ہمارے اعلیٰ حضرت بادشاہ نہ کہلائیں تو حضرت عالمگیر شہنشاہ کیسے کہلائیں گے!؟"

مرزا محمد بانو کی بات سن کر لاجواب ہو گیا اور پھر مزید کچھ نہیں بولا۔

آئندہ روز ہی مرزا محمد حیدر آباد سے واپس چلا گیا اورنگ زیب عالمگیر ان دنوں برہان پور میں تھا اور دکن پر بھرپور حملے کا حکم دے چکا تھا۔ اس کے حکم کی تعمیل میں شہزادہ محمد معظم اور خان جہاں تیزی کے ساتھ دکن کی طرف بڑھ رہے تھے۔ جلد ہی یہ اطلاع تانا شاہ کو مل گئی۔ اس نے فوری طور پر امرا اور فوج کے سالاروں کو طلب کر لیا۔ باہم مشورے کے بعد تانا شاہ نے خلیل اللہ خان' عبدالرزاق اور دوسرے دو سالاروں شیخ منہاج اور رستم راؤ کو مغل فوجوں کے مقابلے پر متعین کیا۔ اپنے باپ کے ساتھ اس معرکے میں بانو بھی تھی۔ ان تمام سرداروں کی کمان میں تقریباً چالیس ہزار فوج بادشاہی لشکر کے مقابلے میں روانہ ہوئی۔ ان سرداروں میں رستم راؤ' ابو الحسن کے صاحب سیف و قلم ہندو مشیروں میں سے تھا اور مرہٹہ سردار مادنا کا چچا زاد تھا۔

اس وقت تک مغل لشکر دکن کی سرحد تک پہنچ چکا تھا۔ شام ہو چکی تھی اس لیے لشکر کو پڑاؤ ڈالنے کا حکم دے دیا گیا۔ اس لشکر کے تقریباً فرسخ کے فاصلے پر قطب شاہی لشکر موجود تھا۔

اس رات بانو نے اپنے باپ عبدالرزاق کے خیمے میں پہنچ کر خلوت میں اس سے کہا۔ "بابا جانی! مصالحت کا یہ آخری موقع ہے۔ اگر آپ کا حکم ہو

تو میں مغل لشکر میں صلح کا پیغام لے کر جانے پر آمادہ ہوں۔ میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ مغل شہزادہ مصالحت پر آمادہ ہو جائے گا۔"

"میں تن تنہا اتنا بڑا قدم نہیں اٹھا سکتا۔ مجھے اس کے لیے اپنے ساتھ آنے والے سالاروں سے مشورہ کر کے انہیں اپنا ہمنوا بنانا پڑے گا۔ ویسے ذاتی طور میں تمہارے اس خیال سے متفق ہوں۔ اس طرح خلق خدا کا خون نہیں بہے گا۔" عبدالرزاق فکر مند لہجے میں بولا۔

"زیادہ فکر مجھے رستم راؤ کی طرف سے ہے' وہ صلح کے حق میں نہیں ہو گا۔"

"تو پھر دیر نہ کریں' آپ سالاروں سے جا کر بات کر لیں۔ رہا رستم راؤ تو جب اسے معلوم ہو گا کہ خلیل اللہ خان اور شیخ منہاج اور خود آپ صلح پر تیار ہیں تو مجبور ہو جائے گا۔"

پھر وہی ہوا جو بانو نے کہا تھا۔ عبدالرزاق نے دونوں مسلمان سالاروں کو اپنا ہمنوا بنا لیا اور رستم راؤ بھی صلح کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ بانو مردانہ لباس زیب تن کر کے ایک گھوڑے پر سوار ہوئی اور مغل لشکر کی طرف روانہ ہو گئی۔ اس کے ہاتھ میں سفید جھنڈا تھا۔

بانو کو لشکر گاہ میں داخل ہونے سے پہلے ہی روک لیا گیا۔ پھر جب اس نے بتایا کہ وہ کس مقصد سے اور کہاں سے آ رہی ہے تو اسے شہزادہ معظم کے خیمے میں پہنچا دیا گیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ بانو کسی مغل شہزادے کے روبرو تھی۔ بانو اس وقت اپنی عمر کی تیسری دہائی کے اختتام پر تھی اور شہزادہ معظم پانچویں دہائی کے آغاز میں تھا۔ معلوم نہیں کیوں مغل شہزادے کو پہلی بار دیکھ کر بانو کے دل کی دھڑکنوں میں اضافہ ہو گیا۔ ایسا زندگی میں پہلی بار ہوا تھا۔ شہزادے کی وجاہت نے بانو کو متاثر کیا تھا۔ بانو نے اتنے موثر انداز میں اپنا مدعا بیان کیا کہ شہزادہ معظم بالآخر صلح پر آمادہ ہو گیا۔ بانو کی یہ بہت بڑی کامیابی تھی۔

مغل شہزادہ محمد معظم جو بعد میں شاہ عالم کہلایا' اس نے صلح کی شرائط

بیان کیں۔

"اگر ابوالحسن ان امور پر راضی ہو جائے جو ہم بیان کرنے والے ہیں تو اس کے قصوروں کی معافی کے لیے ہم بارگاہ شاہی میں سفارش کر سکتے ہیں۔ اول یہ کہ وہ اظہار ندامت کرے اور معافی کی درخواست دے۔ دوم امور مملکت سے اکنا مادنا کو بیدخل کر کے انہیں قید میں ڈال دے۔ سوم یہ کہ سیٹرم اور رام گیر وغیرہ پرگنوں سے جن پر بے جا دعوی کر کے اس نے قبضہ کر لیا ہے دستبردار ہو جائے اور ان علاقوں کو پھر بادشاہی کارندوں کے حوالے کر دے۔ چہارم یہ کہ وہ موجودہ اور سابقہ ساری پیشکش' یعنی خراج اور نذرانہ بلا توقف دربار میں روانہ کر دے۔

بانو صلح کی یہ شرائط لے کر اپنی لشکر میں پہنچی تو وہاں اور ہی گل کھل چکا تھا۔ رستم راؤ نے تانا شاہ کے پاس اپنا ایک قاصد بھیج دیا تھا کہ اس کی مرضی و منشاء حاصل کیے بغیر بانو اور اس کے باپ عبدالرزاق نے مغلوں سے ساز باز کر لی ہے جس کے نتیجے میں بانو صلح کا پیغام لے کر مغل شہزادے کے پاس گئی ہے۔ رستم راؤ کا قاصد جب تانا شاہ کے پاس پہنچا تو مرہٹہ سردار اکنا دمنا بھی اس کے پاس بیٹھے تھے۔ انہوں نے تانا شاہ کو بانس پر چڑھا دیا۔ تانا شاہ نے سوچے سمجھے بغیر تمام سالاروں کو یہ پیغام بھیجا کہ مغلوں سے ہرگز صلح نہ کی جائے۔ بانو جب شہزادے سے مل کر لوٹی تو اس کے باپ عبدالرزاق نے اسے تانا شاہ کے پیغام سے آگاہ کیا۔ یوں بانو کے سارے کیے دھرے پر پانی پھر گیا۔ ایک قاصد کے ذریعے مغل شہزادے کو یہ پیغام بھیج دیا گیا کہ صلح کی شرائط ناقابل قبول ہیں۔

اسی کے نتیجے میں دوسرے دن صبح قطب شاہی اور مغل افواج کے درمیان معرکہ آرائی شروع ہو گئی۔ چالیس ہزار قطب شاہی فوج کے مقابلے خان جہاں اپنے ساتھ صرف گیارہ ہزار سواروں کو لایا تھا۔ صبح دم ہی کوچ کے نقارے اور پھر طبل جنگ بجنے لگا تھا۔

پھر بان سنسنانے اور توپیں دندنانے لگیں۔ ایسا سخت معرکہ ہوا کہ سہ پہر تک ہر طرف لاشوں کے انبار لگ گئے۔ مغل فوج کو چاروں طرف سے گھیر لیا گیا تھا۔

مغل فوج پر لمحہ بہ لمحہ دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ خان جہاں' دکن کی فوجوں سے اس قدر مغلوب ہو گیا تھا کہ اسے اپنی نجات دشوار نظر آ رہی تھی۔ ہر گھڑی دکن والوں کے حملے شدید ہوتے جا رہے تھے۔ خان جہاں ایک ہاتھی پر سوار مغل فوج کی کمان کر رہا تھا۔ بانو کی کوشش یہ تھی کہ کسی طرح صفوں کو چیرتی ہوئی خان جہاں تک پہنچ جائے' مگر مغل سپاہی اس کی راہ میں رکاوٹ بنے ہوئے تھے۔ وہ گھوڑے پر سوار بڑی بے جگری سے لڑ رہی تھی۔ بالآخر کئی مغل سپاہیوں' کے سر تن سے جدا کرنے کے بعد بانو کو ایک موقع مل ہی گیا اور وہ اپنا گھوڑا اڑاتی ہوئی خان جہاں کے ہاتھی تک پہنچ گئی۔ اس نے اپنے ہاتھوں میں ایک بھالا اٹھایا ہوا تھا۔

بانو ابھی خان جہاں پر بھالا پھینکنے ہی والی تھی کہ اچانک عقب سے اسے زبردست چیخ و پکارا سنائی دی۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو قیامت کا سماں تھا۔ ایک مست جنگی ہاتھی نے قطب شاہی فوج میں قیامت برپا کر دی تھی۔ ہاتھی کے منہ میں تین چار من کی آہنی زنجیر تھی وہ بڑی تباہی مچا رہا تھا۔ ہاتھی جدھر بھی بھاری زنجیر سے ضرب لگاتا اور اپنی سونڈ ہلاتا ہوا حملہ کرتا تھا صفیں کی صفیں درہم برہم ہو جاتی تھیں۔ اس مست ہاتھی کو دیکھ کر قطب شاہی سواروں کے گھوڑے بدک گئے۔ بہت سے گھوڑوں نے اپنے سواروں کو زین سے اچھال دیا۔ خود بانو کا گھوڑا بھی بدک کر ایک طرف بھاگا۔ بانو نے اسے بڑی مشکل سے قابو میں کیا۔

ہاتھی نے جنگ کا پانسا پلٹ دیا۔ قطب شاہی فوج پسپا ہو گئی۔ خان جہاں نے فتح کا شادیانہ بجوا دیا اور اسی جگہ خیمے لگانے کا حکم دیا۔

اس رات بانو کے ذہن میں ایک اور انوکھی تجویز آئی۔ اس نے

عبدالرزاق سے اس تجویز کا ذکر کیا۔ یہ تجویز ایسی نہیں تھی جس کے لئے دوسرے سالاروں کو اپنا ہمنوا بنانا پڑتا یا قطب شاہی حکمران تانا شاہ سے اس کی اجازت مطلوب ہوتی۔ پھر بھی عبدالرزاق نے ایک تیز رفتار قاصد بھیج کر تانا شاہ سے اس تجویز کی منظوری لے لی۔

بانو ایک بار پھر سفید پرچم لہراتی ہوئی مغل لشکر کی طرف اڑی جا رہی تھی۔ آج رات وہ ایک ایسی تجویز لے کر مغل شہزادے کے پاس جا رہی تھی جس سے خلق خدا کی خونریزی ختم ہو جاتی۔

پہلے ہی کی طرح بانو کو کشاں کشاں پھر شہزادے کے خیمے میں پہنچا دیا گیا۔ شہزادہ شاہ عالم نے اسے پہچان لیا اور بولا۔

"تم پھر آ گئے!"

"ہاں مگر آج میرے پاس صلح کا پیغام نہیں ہے۔"

بانو بلا جھجک مردانہ آواز میں بولی۔

"پھر کیوں آئے ہو؟

شہزادے نے سوال کیا۔

جواب میں بانو نے جو کچھ کہا، مغل شہزادہ اسے سن کر حیران رہ گیا۔ ایسی تجویز اس سے پہلے کبھی اس کے سامنے پیش نہیں کی گئی تھی۔

بانو نے شہزادے سے کہا تھا۔

"صف در صف جنگ میں دونوں طرف کے مسلمانوں کی کثیر تعداد ہلاک ہو رہی ہے۔ بہتر یہ ہے کہ ہمارے ایک دو سردار اور حضور والا کے تین چار سردار، فوجوں کو درمیان میں لائے بغیر میدان میں آئیں اور ایک دوسرے سے مقابلہ کر لیں۔ وہ فن سپہ گری میں اپنے اپنے زور بازو کا مظاہرہ کریں۔ پھر دیکھیں کہ اللہ کس کی مدد کرتا ہے!"

شاہ عالم کچھ دیر یہ تجویز سن کر خاموش رہا، پھر بولا۔

"تمہاری یہ تجویز ہمارے لیے قابل قبول نہیں۔"

بالا آخر بانو کو ناکام لوٹنا پڑا۔ دوسرے دن صبح یہ خبر ملی کہ اورنگ زیب بہ نفس نفیس دکن کی طرف ایک زبردست لشکر لیکر بڑھ رہا ہے تو تانا شاہ کے حواس گم ہو گئے۔ اس نے عبدالرزاق اور بانو کو مشورہ کرنے کے لیے طلب کیا۔ بانو نے پھر مصالحت پر اصرار کیا۔ مرہٹہ سرداروں نے اس کی سخت مخالفت کی یہاں تک کہ انہوں نے عبدالرزاق اور بانو پر یہ الزام لگایا کہ یہ دونوں مغلوں سے مل گئے ہیں۔

تانا شاہ عبدالرزاق کی وفاداری سے بہ خوبی آگاہ تھا اور بانو تو اس کی منہ بولی بیٹی تھی ہی اسے مرہٹہ سرداروں کی یہ بات ناگوار ہوئی اور اس نے کہا۔

"اگر تم لوگ مفتوحہ علاقوں میں لوٹ مار نہ کرتے تو آج یہ دن دیکھنا نہ پڑتا۔"

اس کا اشارہ ان علاقوں کی طرف تھا جو پہلے مغلوں کے زیر نگین تھے اور جنہیں شرزہ خاں نے مرہٹوں کی مدد سے فتح کر لیا تھا۔

مرہٹہ سردار خاموش ہو گئے۔ اس وقت کچھ بولنا انہیں خلاف مصلحت معلوم ہوا۔ وہ دل ہی دل میں ایک اور سازش کے تانے بانے بن رہے تھے۔

پھر اس روز مغل فوجوں اور دکنی فوجوں کے درمیان بڑا گھمسان کا رن پڑا۔ اس جنگ میں ایک قطب شاہی امیر خلیل اللہ خان نے بڑی جواں مردی کا مظاہرہ کیا۔ یہی شہر حیدر آباد کی فوج کا سالار بھی تھا۔ مرہٹے میدان جنگ میں نہ ٹک سکے اور انہی کی وجہ سے شام ہوتے ہوتے قطب شاہی فوج کو پسپائی اختیار کرنا پڑی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے دن مرہٹہ سرداروں نے خلیل اللہ خان کے خلاف تانا شاہ کو ہموار کر لیا۔ شکست کی ساری ذمہ داری انہوں نے اپنی بجائے خلیل اللہ خان پر ڈال دی تھی۔

اکنا دمنا نے خلیل اللہ خان پر بھی یہی الزام لگایا تھا کہ وہ درپردہ مغل

شہزادے سے مل گیا ہے۔ تانا شاہ کو ان دونوں نے اس قدر بدظن کر دیا تھا کہ اس نے خلیل اللہ خان کو قید کر لینے بلکہ قتل کرانے کا بندوبست کر رکھا تھا۔ کسی طرح یہ اطلاع خلیل اللہ خان کو بھی مل گئی وہ واقعی مغل شہزادے کی خدمت میں حاضر ہو گیا اور عنایات و اکرامات سے نوازا گیا۔ جب یہ خبر عام ہوئی کہ خلیل اللہ خان جیسا جری سردار' شاہ عالم سے مل گیا ہے تو تانا شاہ بد حواس ہو گیا۔ اس نازک موقع پر بانو اور اس کے باپ عبدالرزاق نے تانا شاہ کو تسلی دی۔

ادھر تو اس دن عبدالرزاق اور بانو مغل فوجوں کے مقابل داد شجاعت دیتے رہے' ادھر مرہٹہ سرداروں نے ایک اور ہی چال چلی۔ انہوں نے تانا شاہ کو مشورہ دیا کہ یہ موقع غنیمت ہے' حیدر آباد شہر کو بچانا ممکن نہیں اس لیے قلعہ گولکنڈہ میں پناہ لے لی جائے۔ تانا شاہ نے ان کا مشورہ قبول کر لیا۔ مرہٹہ سرداروں نے اس کے دل میں یہ خوف بٹھا دیا تھا کہ اگر اورنگ زیب یہاں اپنا لشکر لے کر پہنچ گیا تو پھر فرار کا موقع بھی نہیں ملے گا۔ مرہٹہ سرداروں نے تانا شاہ کو یہ مشورہ بھی دیا تھا کہ وہ راز داری برتے اور کسی کو اپنے فرار ہونے کی خبر نہ دے۔ پھر تانا شاہ نے ایسا ہی کیا۔ اس نے نہ تو اپنے اراکین سلطنت سے مشورہ کیا' نہ لوگوں کے مال و اسباب بچانے کا کوئی انتظام کرایا' بس چپکے سے دن مندتے ہی اپنے محل کی عورتوں' جواہرات اور ہون کے صندوقوں کو پار کرا کے قلعہ گولکنڈہ کی طرف نکل گیا۔

جیسے ہی تانا شاہ کے فرار کی خبر پھیلی شہر میں لوٹ مار شروع ہو گئی۔ لوٹ مار کا یہ ہنگامہ مرہٹوں نے شروع کیا تھا جس میں شہر کے اوباش اور غنڈے بھی شامل ہو گئے تھے' خود تانا شاہ کے ذخائر اور تاجروں کا مال و اسباب جو چار پانچ کروڑ کا ہو گا' لوٹ لیا گیا۔ اس دن شہر حیدر آباد میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قیامت ٹوٹ پڑی ہے۔ ابھی صبح نہیں ہوئی تھی کہ مغل فوج نے شہر پر حملہ کر دیا اور بلا روک ٹوک اندر داخل ہو گئی۔

عبدالرزاق' بانو اور اپنی بیوی کو لے کر بہ مشکل قلعہ گولکنڈہ تک پہنچ گیا۔ اگر تانا شاہ' مرہٹہ سرداروں کی بات نہ مانتا تو اتنی تباہی و بربادی نہ ہوتی۔ اس بات کا احساس خود اسے بھی ہو گیا مگر اب وقت گزر چکا تھا اسے اب رہ رہ کر یہ خیال آ رہا تھا کہ بانو نے مغل شہزادے شاہ عالم سے مصالحت کی جو گفتگو شروع کی تھی اور جواباً" شہزادے نے جو شرائط رکھی تھیں' انہیں مان لینا چاہئے تھا۔ شہر حیدر آباد کی تباہی و بربادی کا اس نے جو حال سنا تھا اسے سن کر اس کا دل خون ہو رہا تھا۔ وہ اس رنج و ملال میں گرفتار تھا کہ بانو اس سے ملنے پہنچ گئی۔ اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ بانو کے چہرے سے اب بھی مایوسی اور مردہ دلی کا اظہار نہیں ہو رہا تھا۔

بانو نے آتے ہی تانا شاہ سے کہا "اعلیٰ حضرت اگر میری گزارش قبول فرمالیں تو اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ سارا معاملہ سدھر سکتا ہے۔"

"مگر کیسے؟" ابو الحسن تانا شاہ نے حیران ہو کر پوچھا۔

○--------○--------○

آخر وہ بات بانو کی زبان پر آہی گئی جو بہت دن سے اس کے دل میں تھی۔ اس نے کہا۔ "حضور کو اپنے دو امراء کے قتل پر راضی ہونا پڑے گا۔ اس کنیز کے خیال میں وہ دونوں ہی سارے فتنے کی جڑ ہیں اور انہیں کی وجہ سے معاملات بگڑتے جا رہے ہیں"

"مگر یہ تو بتاؤ کہ وہ ہیں کون؟" تانا شاہ نے سوال کیا۔

"وہ جن کی وجہ سے دکن پر فوج کشی کی آفت آئی اور بے دریغ مسلمانوں کا خون بہا!" بانو کی آواز میں دکھ تھا۔ یہ دونوں وہی ہیں جنہوں نے حضور کو شہر سے فرار ہونے کا مشورہ دیا تھا۔"

تانا شاہ اس کا اشارہ سمجھ گیا اور بولا۔ "تم شاید مرہٹہ سرداروں اکنا مادنا کی بات کر رہی ہو' مگر ایسے نازک حالات میں مرہٹوں سے بگاڑ ہمیں مہنگا پڑے گا"

"یہ مہنگا سودا سہی مگر اب اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے" بانو کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔ بانو کی بات سن کر تانا شاہ کچھ نرم پڑ گیا' پھر بولا۔ "مگر ان دونوں

کو قتل کر دینے سے بگڑے ہوئے حالات کس طرح سدھر جائیں گے؟"

"حضور محترم کو شاید یاد ہو کہ پہلی مرتبہ مغل شہزادے نے صلح کی جو شرائط رکھی تھیں' ان میں بھی انہیں دونوں کی معزولی اور گرفتاری کی شرط تھی۔ انہوں نے اسی لیے صلح نہیں ہونے دی۔ اب اگر صلح کی بات ہوئی تو بھی یہ شرط لازمی ہو گی۔ میں حضور والا سے یہ اختیار چاہتی ہوں کہ اگر صلح نامے میں یہ شرط ہو تو قبول کر لی جائے"

"یعنی تم پھر ایک بار شہزادے سے مصالحت کی گفتگو کرنا چاہتی ہو! تانا شاہ نے وضاحت چاہی۔

" "جی ہاں اعلیٰ حضرت! مجھے اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھروسہ ہے کہ میں مغل شہزادے کو صلح کرنے پر آمادہ کر لوں گی بشرطیکہ حضور والا اس کنیز کو یہ اختیار عطا کر دیں۔"

اندھا کیا چاہے' دو آنکھیں تانا شاہ فوراً راضی ہو گیا۔

بانو کے ایماء پر بڑی راز داری کے ساتھ ابو الحسن تانا شاہ کی طرف سے مغل شہزادے شاہ عالم کو عاجزی آمیز معافی کی درخواست لکھی گئی۔ اس درخواست میں تانا شاہ نے کردہ و ناکردہ قصوروں کی معافی چاہی تھی۔

وقت ضائع کیے بغیر اسی وقت بانو' مغل لشکر کی طرف روانہ ہو گئی۔ مختصر عرصے میں بانو تیسری بار مغل شہزادے شاہ عالم سے ملنے جا رہی تھی۔ پہلے بھی اس نے قطب شاہی سفیر کی حیثیت سے صلح کی شرائط طے کر لی تھیں مگر بعد میں ان پر عملدرآمد نہیں ہوا تھا۔ اسی وجہ سے بانو کو یہ خدشہ تھا کہ شاید مغل شہزادہ اب صلح پر آمادہ نہ ہو۔ انہی خدشات اور خیالات کی دھوپ چھاؤں میں بانو' مغل لشکر کے قریب پہنچ گئی۔ اس کے ہاتھ میں سفید پرچم تھا اس لیے مغل سپاہیوں نے اسے آمد کا مقصد بیان کرنے کے بعد شہزادے کے خیمے میں پہنچا دیا۔

اس پر نظر پڑتے ہی شہزادے شاہ عالم کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔ بانو اس کے سامنے تین بار جھک کر تسلیمات بجالائی۔

"ہم تجھے پہچان گئے ہیں کہ تو کون ہے!"

شاہ عالم کی آواز بلند ہوئی اور بانو کا دل تیزی سے دھڑک اٹھا کہیں اس کا یہ راز کھل تو نہیں گیا کہ وہ مرد نہیں عورت ہے۔ ذرا دیر خاموشی کے بعد شہزادہ پھر بولا۔

"میدان جنگ میں ہم نے تیری تلوار کے جوہر دیکھے ہیں۔ بلاشبہ تو ایک بہترین شمشیرزن ہے' مگراس وقت تو کس حیثیت سے آیا ہے؟"

"حضور کا اقبال بلند ہو۔"

بانو مردانہ آواز میں بولی۔ "یہ غلام اعلیٰ حضرت ابو الحسن تانا شاہ کا ایک پیغام لیکر آیا ہے۔ یہ غلام قاصد بھی ہے اور قطب شاہی سفیر بھی!"

یہ کہہ کر بانو نے جھک کر تانا شاہ کا تحریری پیغام شہزادے کی خدمت میں پیش کر دیا۔

شاہ عالم نے اس مختصر پیغام پر ایک نگاہ ڈالی' پھر کہا

"صلح کا وقت اب گزر چکا ہے' بہتر یہ ہے کہ فیصلہ میدان جنگ میں ہو"

"اے عالی وقار شہزادے! خلق خدا کا بہت خون بہہ چکا ہے"

پھر بانو نے شہر حیدر آباد کی تباہی کا نقشہ موثر الفاظ میں پیش کیا اور درخواست کی۔

"حضور والا اگر چاہیں تو مزید خونریزی رک سکتی ہے۔ حضور کو بارگاہ ایزدی سے اس کار ثواب کا اجر عظیم ملے گا۔"

"تم لوگوں نے مصالحت کو مذاق بنا رکھا ہے۔ شاہ عالم سخت لہجے میں بولا۔"

"کیا تو پہلے بھی ہم سے مصالحت کی بات کر کے نہیں گیا تھا؟"

پھر کیا ہوا؟ تانا شاہ کیوں عہد سے پھر گیا؟"

"اب ایسا نہیں ہو گا۔ انہوں نے مجھے مختار بنا کر بھیجا ہے کہ ان کی

طرف سے صلح کی شرائط قبول کرنے کا میں مجاز ہوں"

بانو کے لہجے میں انکسار تھا۔

اگر تو تانا شاہ کی طرف سے شرائط قبول کرنے کا مجاز ہے تو شہزادہ کچھ کہتے کہتے رک گیا' پھر ذرا توقف سے بولا۔

"پھر.... پھر تیری درخواست پر غور کیا جاسکتا ہے"

بانو کی مزید عاجزانہ گفتگو نے شاہ عالم کے دل پر اثر کیا۔ مگر حیدر آباد کے لوگوں کی حالت واقعی قابل رحم تھی اور اس کا علم خود اسے بھی تھا۔ بالاخر اسے رحم آہی گیا۔ اس نے مندرجہ ذیل شرائط پر بادشاہ کے پاس ابو الحسن تانا شاہ کے معافی نامے کی سفارش کرنے کی ہامی بھرلی۔

پہلی شرط یہ تھی کہ ابو الحسن ایک کروڑ بیس لاکھ روپے بطور نذرانہ پیش کرے۔ یہ رقم سالانہ مقررہ خراج کے علاوہ تھی۔

دوسری شرط تھی کہ مرہٹہ سرداروں اکنا اور مادنا کو گرفتار کر کے بیدخل کر دیا جائے کیونکہ یہی دونوں بھائی حیدر آباد کی تباہی کے ذمہ دار ہیں۔

آخری شرط یہ تھی کہ گڑھی سیٹرم' پرگنہ کہیر اور دوسرے مفتوحہ علاقے فوری طور پر مغلوں کے حوالے کر دیئے جائیں اور ابو الحسن ان علاقوں سے دستبردار ہو جائے۔

ان شرائط میں پہلی شرط بہت کڑی تھی' مگر بانو نے وقت کی نزاکت کو مدنظر رکھتے ہوئے تمام شرائط قبول کر لیں۔ اس کے خیال میں یہ ایک بڑی کامیابی تھی کہ مغل شہزادہ مصالحت پر آمادہ ہو گیا تھا۔

مغل لشکر سے لوٹ کر آنے کے بعد وہ فوری طور پر تانا شاہ سے ملی اور اسے مصالحت کی خوش خبری سنانے کے ساتھ صلح کی شرائط سے بھی آگاہ کیا۔ شرائط سن کر تانا شاہ کے چہرے سے فکر مندی کا اظہار ہونے لگا۔ چاہئے تو یہ تھا کہ وہ اسی وقت مرہٹہ سرداروں کی گرفتاری کے احکام جاری کر دیتا مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔

مزید دو روز گزر گئے لیکن مرہٹہ سرداروں کی گرفتاری عمل میں نہ
آئی۔ بانو کے مراسم محل کی بیگمات سے بھی تھے۔ مرحوم عبد اللہ شاہ قطب
الملک کی دو با اثر بیگمات اسے پسند کرتی تھی۔ ان میں سے جانی صاحبہ' تانا شاہ
ساس تھیں۔ بانو ان دونوں بیگمات سے ملی۔ یہ دونوں ہی محل میں بڑا تسلط او
اثر رکھتی تھیں۔

"ہم اچھی طرح جانتے ہیں بانو کہ انہی دجال صفت بھائیوں کی وج
سے معاملات بگڑتے جا رہے ہیں۔"

بانو کی بات سن کر جانی صاحبہ نے کہا

"ہم تمہیں اجازت دیتے ہیں کہ تم ان دونوں زناریوں کا قصہ پاک ک
دو اور اگر ممکن ہو تو ان کے چچا زاد فتنہ پرداز رستم راؤ کو بھی ٹھکانے لگا دو۔
اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ تم نے جن شرائط پر مغلوں سے مصالحت ک
ہے' انہیں بہر حال پورا کیا جائے۔ ہمیں یقین ہے کہ ہمارا فرزند تانا شاہ اس
سلسلے میں چشم پوشی سے کام لے گا۔"

بانو کے لیے یہ بڑی حوصلہ افزاء بات تھی۔ اس نے اسی روز اپنے
باپ عبدالرزاق سے بھی مشورہ کیا اور اسے ہموار کر لیا۔ اپنے باپ کے کہنے پ
بانو نے سات بہترین شمشیر زنوں کو اپنے ساتھ لیا اور ایک جگہ گھات لگا کر بیٹھ
گئی۔

دونوں بھائی اکنا اور مادنا دربار سے نکل کر گھر کی طرف جا رہے تھے ک
بانو ان پر فرشتہ اجل بن کر ٹوٹ پڑی۔ حملہ اچانک ہوا تھا اس لیے ان دونوں کو
سنبھلنے کا موقع نہیں مل سکا۔ انہیں قتل کرنے کے بعد بانو نے ان کے سر کاٹ
کر اپنی حویلی بھیج دیئے۔ رستم راؤ اپنے گھر جا چکا تھا' بانو نے اس کے گھر میں
گھس کر اسے قتل کر دیا۔ اس واقعہ کے بعد بانو ہی کے اشارے پر ان تینوں کا
گھر بار اور مال و اسباب بھی لوٹ لیا گیا۔ کیونکہ انہوں نے بہت دولت جمع کر
رکھی تھی۔

اسی دن بانو دونوں مرہٹہ سرداروں کے کٹے ہوئے سر لیکر مغل شہزادے شاہ عالم کے حضور میں پہنچی اور تسلیمات بجا لانے کے بعد مرہٹہ سرداروں کے کٹے ہوئے سر شہزادے کے قدموں میں ڈال دیئے' پھر بولی

"اے عالی مرتبت شہزادے! تین شرائط میں سے ایک شرط پوری کر دی گئی۔"

شاہ عالم نے اس پر خوشی کا اظہار کیا اور بانو کو بتایا کہ ابو الحسن تانا شاہ کا معافی نامہ اورنگزیب کو روانہ کر دیا گیا ہے۔

○-------○-------○

جب ابو الحسن تانا شاہ کے ساتھ صلح کے متعلق شہزادہ شاہ عالم کی
عرضداشت اورنگزیب کے پاس پہنچی تو بظاہر اس نے منظوری کا اعلان کر دیا' مگر
حقیقتاً وہ اس پر خوش نہیں تھا۔ اس نے ایک تربیت یافتہ امیر سعادت خان کو
حجابت (سفارت) کے عہدے پر مامور کر کے دکن کے سابقہ اور حالیہ نذرانہ ا
خراج وصول کرنے کی تاکید کی۔ خفیہ طور پر اورنگزیب نے اس صلح کے بار
میں شاہ عالم سے سخت ناراضگی کا اظہار کیا کیونکہ اس کا ارادہ دکن کو فتح کر
تھا۔ پھر بھی اس نے بادل نخواستہ ابو الحسن تانا شاہ کا معافی نامہ قبول کرنے کے
اظہار میں اسے خلعت بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ یہ خلعت اور کچھ جواہر لیکر اورنگزیب
کی طرف سے ایک امیر میر عبد الکریم دکن روانہ ہوا۔ اس کے ساتھ چند او
مغل نامی گرامی امیر بھی تھے۔

تانا شاہ کو بھی یہ اطلاعات مل گئیں۔ میر عبد الکریم یہ سب عطیات
لیکر حیدر آباد کے قریب پہنچ گیا۔ شرزہ خاں قلعہ گولکنڈہ ہی میں تھا وہ خلوت
میں تانا شاہ سے ملا اور کہا۔

"حضور عالی!"

اورنگزیب خلعت و جواہرات بھیجنے کے بہانے ہمیں سخت چوٹ دینا چاہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اس کی آڑ میں میر عبد الکریم فوج لیکر قلعے میں داخل ہو جائے۔"

اس کی بجائے کہ تانا شاہ اس مسئلے پر خود غور کرتا یا اپنے وفادار امراء سے مشورہ کرتا' وہ شرزہ خاں کی باتوں میں آگیا۔ اس نے میر عبد الکریم پر حملے کا حکم دیدیا۔ ستم یہ کہ تانا شاہ کا حکم عبدالرزاق کو ملا جو شرزہ خاں سے متعلق تھا اس کے باوجود اسے شرزہ خاں کے ساتھ قلعہ سے نکلنا پڑا۔ شرزہ خاں اور عبدالرزاق نے اچانک مغل امراء اور ان کی فوج پر حملہ کر دیا۔ مغل چونکہ غافل تھے نیز بادشاہی لشکر سے انہیں کوئی کمک بھی نہیں مل سکتی تھی اس لیے شکست کھا گئے۔ فوج کے کئی سالاروں کو گرفتار کر لیا گیا۔ بقیہ فوج کو عبدالرزاق کے سپاہیوں نے تاخت و تاراج کر دیا۔

اس واقعے کے بعد اورنگزیب نے شاہ عالم کو اپنے حضور طلب کر لیا۔ اس وقت وہ قلعہ بیجاپورہ کی تسخیر میں سرگرم عمل تھا۔ یہ واقعہ ۱۰۹۷ء کے آغاز کا ہے۔ قلعہ بیجاپور کی فتح کے بعد اورنگزیب نے حاجب دکن سعادت خاں کو فرمان جاری کیا ابو الحسن تانا شاہ سے وصول طلب خراج اور نذرانے کی رقم سختی کے ساتھ وصول کی جائے۔ خفیہ طور پر اسی پیغام کے ساتھ ساتھ اپنے ایک بااعتبار قاصد کے ذریعے اورنگزیب نے سعادت خاں کو تحریری پیغام دیا کہ ہم نے دکن کی تسخیر کا قطعی ارادہ کر لیا ہے۔ بہت جلد ہماری سواری وہاں پہنچنے والی ہے۔ تم رقم کی وصولی میں پوری شدت اور سختی سے کام لو۔ اگر ابو الحسن فوری طور پر ہمارے مطالبات پورے نہ کر سکا تو ہمارے ہاتھ ایک بہانہ آجائیگا اور یوں ہم اس پر حملہ کر سکیں گے۔

اورنگزیب کے حکم پر سعادت خاں نے ایسا ہی کیا حیدر آباد شہر کی تباہی کے بعد قطب شاہی خزانہ تقریباً خالی ہو چکا تھا۔ پھر بھی خزانے میں جو کچھ

تھا' تانا شاہ نے سعادت خان کے حوالے کر دیا۔ مزید زر نقد فراہم کرنے سے اس نے معذوری ظاہر کی اور بولا۔

"چونکہ میں مزید زرنقد فراہم کرنے سے معذور ہوں اس لیے جتنے بھی جواہرات اور زیورات' محل میں عورتوں کے پاس ہیں اور جو بھی مرصع آلات موجود ہیں' بھجوائے دیتا ہوں۔ آپ کسی خواجہ سرا کو بھیجوادیں تاکہ محل میں جو کچھ زیورات اور مرصع سازو سامان ہے' علیحدہ کروا کے اس کے حوالے کردوں۔"

سعادت خان اس پر آمادہ نہ ہوا۔ وہ اورنگزیب کے اشارے پر انتہائی سختی سے کام لے رہا تھا۔ تانا شاہ نے خود ہی سعادت خان کے آدمیوں کو دوسرے روز بلوایا' پھر جواہرات اور مرصع آلات کے نو تھال ان کی فہرستوں کے ساتھ سرپوش باندھ کر سعادت خان کو بھجوا دیئے۔

تانا شاہ کی عاجزی اور لجاجت کے باوجود اورنگزیب نے گولکنڈہ کی طرف کوچ کر دیا۔ یہ خبر تانا شاہ کو ملی تو وہ سخت پریشان ہوگیا۔ عبدالرزاق اور بانو کے ایماء پر اس نے ایک عریضہ اورنگزیب کو روانہ کیا جس میں اظہار اطاعت کرتے ہوئے قصوروں کی معافی کی التجا تھی۔ اس کے علاوہ یہ بھی لکھا تھا کہ میں نے حضور کے مطالبے پر خزانے میں جو کچھ تھا' حاجب سعادت خاں کے حوالے کر دیا ہے' یہاں تک کہ اپنے محل کی بیگمات کے زیورات بھی اتروا کر بھیجوا دیئے ہیں۔ سعادت خان سے حضور اس کی تصدیق کر سکتے ہیں حضور والا کو جو بات ناگوار خاطر ہوگی' یہ بندہ ناچیز آئندہ اس سے گریز کریگا۔ پھر اس نے سعادت خان سے بھی تصدیق کی خاطر ایک عریضہ اورنگزیب کو روانہ کرا دیا۔

اورنگزیب نے تانا شاہ کے عاجزانہ عریضے کا کوئی جواب نہیں دیا اور بدستور دکن کیطرف پیش قدمی کرتا رہا۔ ہاں اس نے اپنے امیر سعادت خاں کے عریضے کا ضرور جواب دیا۔ اس نے سعادت خاں کو جواباً" لکھا۔

"اگرچہ ابوالحسن تانا شاہ کے افعال قبیح احاطہ تحریر سے باہر ہیں مگرچند

ایک بطور مثال بیان کیے جاتے ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ اس نے اپنے ملک وسلطنت کے اختیارات ایک ظالم و کافر اور فاجر کے ہاتھ میں دے دیئے تھے اور سادات و مشائخ اور علماء کو اس کے ہاتھوں ذلیل و خوار کرایا تھا۔ پھر وہ فسق وفجور کو کھلم کھلا رواج دیتا رہا اور بذات خود بھی ریاست و دولت کے نشے میں مست شب و روز کبائر میں مبتلا رہا۔ اس نے کفرو اسلام' ظلم و عدل' فسق و عبادت کا فرق تک مٹا دیا اور حربی کافروں (مرہٹوں) کی اعانت میں سرگرم رہا۔ اسی کے ساتھ اس نے اوامرو نواہی کی اطاعت قطعاً" ترک کر دی۔ اس نے حکم الٰہی سے سرتابی کر کے اپنے آپ کو خالق و مخلوق دونوں کے نزدیک رسوا کیا۔ ان معاملات میں بار ہا نصیحت آمیز فرمان آداب داں مزاج گرفتہ آدمیوں کے ذریعے دربار سے صادر کیئے گئے مگر اس کے کان پر جوں نہ رینگی۔ اس نے بدکردار سنبھا کے پاس ایک لاکھ ہون بھجوائے۔ بہرحال غرور و مستی میں یہ خدا کو بھول گیا۔ اب معافی کا وقت گزر چکا ہے۔ ہم اسے سزا دینے بہ نفس نفیس پہنچ رہے ہیں"

سعادت خان کو اورنگزیب کا یہ پیغام ملا تو وہ فوراً ہی حیدر آباد سے روانہ ہوگیا۔ تانا شاہ کے کچھ مخبروں کو اس پیغام کے متعلق معلوم ہوگیا تھا جو اورنگزیب نے سعادت خان کو بھیجا تھا۔ انہوں نے اس پیغام اور پھر سعادت خان کی حیدر آباد روانگی کی اطلاع تانا شاہ کو دیدی۔

تنگ آمد بہ جنگ کے مصداق تانا شاہ نے مغل فوج کے مقابلے کے لیے قطب شاہی فوجوں کو مقرر کرنے کی فکر کی۔ اس نے عبدالرزاق' بانو' شیخ منہاج' شنزرہ خاں اور دکن کے دوسرے جنگجو سرداروں کو مقابلے پر مقرر کر کے رخصت کیا۔ روانگی کے وقت اس نے سالاروں کو یہ ہدایت کی کہ اگر مغل بادشاہ اورنگزیب پر تم فتح پا جاؤ تو حتی المقدور کوشش کرنا کہ بادشاہ کو زندہ گرفتار کر لو اور پھر انہیں پورے اعزاز کے ساتھ ہمارے پاس لے آنا۔

یہ سن کر شنزرہ خاں بولا

"ہمارے دل تو مغل بادشاہ کی طرف سے جل کر پھپھولے بنے ہوئے ہیں۔ فتح پانے کے بعد ہم سے اس کا احترام نہ ہو سکے گا۔"

اس موقع پر تانا شاہ نے خاموشی مناسب سمجھی کہ یہی وقت کا تقاضا تھا۔ ایسی نازک صورت حال میں وہ اپنے کسی سالار کو ناراض کرنا نہیں چاہتا تھا۔

مغل لشکر نے حیدر آباد سے دو منزل پر پڑاؤ ڈالا تو دکن کے سردار چالیس پچاس ہزار سوار لیکر آگے بڑھے اور انہوں نے دور دور سے مغل لشکر کی اطراف دائرہ بنا لیا۔ اس کے باوجود ۲۴ ربیع الاول ۱۰۹۷ء کو اورنگزیب نے قلعہ گولکنڈہ پر ایک گولے کی مار کے فاصلے پر اپنی لشکر گاہ قائم کر لی۔ پھر تو گولکنڈے کے اطراف ایک قیامت سی برپا ہو گئی اور اورنگزیب نے قلعہ گیری کی تیاریوں کا حکم دیدیا۔ لشکر کے لوگ دمدمے بنانے، نقب لگانے، مورچے باندھنے اور گولہ باری کرنے کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔ اورنگزیب کو برابر اطلاعات مل رہی تھیں کہ تانا شاہ کی فوجیں، مغل لشکر کے اطراف گشت لگا رہی ہیں اور چھاپے مار رہی ہیں۔ جب اورنگزیب کے حکم پر امرائے لشکر نے ان کاروائیوں کو روکنے کی کوشش کی تو دونوں لشکروں میں زبردست مقابلہ شروع ہو گیا۔ قلعے سے بھی مغلوں پر گولہ باری شروع ہو گئی اور آتشی بان (تیر) پھینکے جانے لگے۔ دکن کی فوجوں کا غلبہ نمایاں تھا کہ اسی اثناء میں سورج ڈوب گیا اور پھر رفتہ رفتہ اندھیرا پھیلنے لگا۔ مجبوراً قطب شاہی فوج کو قلعہ کا رخ کرنا پڑا اور جنگ بند ہو گئی۔ اسی رات بانو کے ایماء پر شب خون مارا گیا۔ مغلوں اور دکنیوں میں بڑی سخت جھڑپ ہوئی۔ اس شب خون میں مغلوں کی طرف سے راجپوتوں کی بڑی جمعیت ماری گئی۔ کامیاب شب خون مارنے کے بعد بانو پھر قلعے میں واپس آگئی۔

قطب شاہی فوج قلعہ بند رہی اور مغل لشکر روز بہ روز اپنے مورچوں کو قلعے کی طرف بڑھاتا رہا۔ انہی دنوں ایک قطب شاہی سالار شیخ

منہاج، عبد الرزاق سے ملنے آیا اور باتوں ہی باتوں میں اس کے منہ سے نکل گیا کہ مغل لشکر پر فتح پانا کسی طرح ممکن نہیں۔ بانو بھی وہاں موجود تھی۔ اسے شیخ منہاج کی بات ناگوار ہوئی اس نے شیخ کو لتاڑ دیا۔ جواباً شیخ منہاج کے دل میں جو کچھ تھا، زبان پر آگیا۔ وہ بولا۔ "میں تو تم لوگوں کی خیر خواہی کے خیال سے آیا تھا کہ یہ موقع مناسب ہے۔ ہمیں چاہیئے کہ ہم مغل بادشاہ کے سامنے حاضر ہو جائیں اور اظہار اطاعت کر کے انعام و اکرام پائیں۔"

"اظہار اطاعت یا اپنے ولئ نعمت سے غداری؟" بانو کے لہجے میں چبھن تھی۔

"تم کیسی باتیں کر رہی ہو بانو! یہ صرف میرا ہی خیال نہیں، کئی اور امیر بھی اس طرح سوچ رہے ہیں۔"

شیخ منہاج نے کہا۔

"آپ ہمیں غداری پر اکسانے آئے ہیں محترم! اگر آپ میرے گھر مہمان نہ ہوتے تو میں آپ کو گرفتار کر لیتی۔"

شیخ منہاج فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ اسی رات وہ اپنے ساتھ کئی اور امرائے قطب شاہی کو لیکر خاموشی کے ساتھ قلعہ سے نکلا اور اورنگزیب کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ اورنگزیب نے اسے اور دیگر قطب شاہی امراء کو عمدہ مناصب و خطابات سے نوازا۔

اب ابوالحسن تانا شاہ کے تمام سالاروں میں صرف تین سالار اس کے ساتھ رہ گئے تھے۔ عبدالرزاق، بانو اور شرزہ خاں!

شہزادہ شاہ عالم گولکنڈہ کے محاصرے میں دائیں بازو کے مورچوں پر متعین تھا۔ بانو نے تانا شاہ کو یہ راہ دکھائی کہ شاہ عالم کو شیشے میں اتارا جائے۔ اسے نہ معلوم کیوں یقین تھا کہ وہ شہزادے کو شیشے میں اتار لے گی۔ اس کے ذہن میں شہزادہ شاہ عالم کو اپنی حمایت اور سفارش پر اکسانے کے لیے ایک بڑی وزنی دلیل تھی۔ یہ دلیل تانا شاہ نے سنی تو اسے بھی وزنی نظر آئی۔ اس نے بانو

کو شہزادہ شاہ عالم سے خفیہ ملاقات کی اجازت دیدی۔

اسی شب بانو مردانہ لباس زیب تن کرکے قلعے سے نکلی۔ وہ چھپتی چھپاتی شاہ عالم کی خیمہ گاہ کے قریب پہنچ گئی اور پھر خود ہی مغل سپاہیوں کے سامنے آگئی اور ان سے کہا کہ میں' شہزادے کے نام ابو الحسن تانا شاہ کا ایک پیغام لایا ہوں' مجھے شہزادے کے پاس پہنچادو۔

شاہ عالم کے عملہ خاص کے محافظ اسے پہچان گئے۔ پہلے بھی وہ کئی بار شہزادہ شاہ عالم سے ملی تھی۔ بہر حال اسے شہزادے کے خیمے میں پہنچا دیا گیا۔ اس وقت شہزادے کے خیمے میں کئی امراء بھی موجود تھے۔ بانو نے ازراہ احتیاط ان کے سامنے خود کو ظاہر نہ کیا اور شہزادے سے خلوت کی اجازت چاہی۔ شاہ عالم بھی اسے پہچان گیا تھا اس نے امراء کو رخصت کردیا تو بانو ادب سے بولی۔

"میں شہزادہ عالی قدر سے یہ عرض گزار ہوں کہ وہ اپنے والد محترم سے ہماری سفارش کریں۔"

"کس بات کی سفارش؟"

شہزادے نے سوال کیا۔

"قصوروں کی معافی اور مصالحت کی سفارش!"

بانو نے جواب دیا۔ "مجھے یہ عرض کرنا ہے کے مصالحت یا جنگ دونوں صورتوں میں یہ مہم شہزادے ہی کی وساطت سے انجام پائے۔"

یہی وہ وزنی دلیل تھی' بانو کو جس کے اثر انداز ہونے کی توقع تھی۔

شاہ عالم واقعی بانو کی دلیل سے متاثر ہوا اور بولا۔

"ہم وعدہ نہیں کرتے البتہ کوشش ضرور کریں گے کہ بادشاہ سلامت ابو الحسن کے قصور معاف کردیں"

"غلام کے لیے یہ بھی بڑی سعادت ہوگی" بانو ادب سے جھکی اور پھر رخصت کی اجازت چاہی۔

شاہ عالم کے محافظ دستے کے چند سپاہیوں نے بانو کو مغل لشکر کی حدود

سے بخریت نکال دیا۔ دوسرے روز اورنگزیب کے مخبروں نے اسے یہ اطلاع پہنچا دی کہ گزشتہ شب تانا شاہ کا کوئی قاصد شہزادہ شاہ عالم سے ملا ہے۔ اس پر اورنگزیب نے سخت ناراضگی کا اظہار کیا۔ یہ خبر بھی شاہ عالم تک پہنچ گئی اور اسے اورنگزیب سے اس سلسلے میں بات کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ شاہ عالم کے بھائی شہزادہ اعظم شاہ کے مخبر اس کے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ اورنگزیب نے کیونکہ شاہ عالم کو ولی عہد قرار دیدیا تھا اس لیے شہزادہ اعظم شاہ اسے بادشاہ کی نظروں سے گرانا چاہتا تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ اورنگزیب شاہ عالم کی بجائے اسے ولی عہد مقرر کردے۔

شہزادہ اعظم شاہ نے شاہ عالم کے متعلق ایسی خبریں اپنے آدمیوں کے ذریعے سارے مغل لشکر میں پھیلوادی تھیں کہ اورنگزیب صلح کی تجویز قبول نہیں کریگا تو شاہ عالم' ابو الحسن تانا شاہ کا ساتھ دے گا۔ یقیناً شاہ عالم کی یہ غلطی تھی کہ چند ہی روز کے بعد اس نے اورنگزیب سے صلح کی سفارش کردی۔ اس طرح گویا ان خبروں کی تصدیق ہوگئی جس کے مطابق شاہ عالم' تانا شاہ سے مل گیا تھا۔ انہیں دنوں ایک ایسا واقعہ پیش آگیا جس نے شاہ عالم ولی عہد سلطنت اور اورنگزیب کے درمیان بدگمانیاں پیدا کردیں۔

ہوا یہ کہ شہزادہ شاہ عالم کے پالکی خانے کے داروغہ نے ایک دن اس سے عرض کیا زنانہ سواریاں دولت خانے سے خاصی دور ٹھہری ہوئی ہیں اور قلعے کے اندر سے قطب شاہی فوج وقت بے وقت نکل کر حملہ کرتی رہتی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ بیگمات کو کوئی نقصان پہنچ جائے۔

شاہ عالم نے حکم دیا۔

"زنان خانے کو دولت خانے سے قریب لے آؤ!"

جب یہ منتقلی ہو رہی تھی تو شہزادہ محمد اعظم شاہ کے ہمراہیوں نے اورنگ زیب کو یہ خبر پہنچا دی کہ شہزادہ شاہ عالم قلعے میں جانے کی فکر کر رہا ہے۔ اس غرض سے زنان خانے کو منتقل کیاجا رہا ہے۔ یہ سنتے ہی اورنگ زیب

عالمگیر کی آتش غضب بھڑک اٹھی۔ اس نے شاہ عالم کے داروغہ غسل خانہ حیات خاں کو خلوت میں طلب کر لیا اور سختی کے ساتھ شاہ عالم کے ارادوں کے متعلق دریافت کیا۔ اس نے عرض کیا کہ شہزادے کی غرض صرف یہی ہے کہ اس کی سفارش پر یا تو ابو الحسن تانا شاہ کو معاف کر دیا جائے یا اس کی کوششوں سے بہ زور شمشیر قلعہ فتح ہو جائے۔ اس کے سوا شہزادے کا کوئی غلط ارادہ نہیں۔ اورنگ زیب نے اپنے ایک اور تربیت یافتہ' عقیدت مند اور راست گو امیر ابو المکارم کو بھی طلب کر لیا اور اس سے بھی شہزادہ شاہ عالم کی بابت استفسار کیا۔ ابو المکارم نے بھی حیات خاں کی تائید کی' پھر بولا۔

"اب ہم کس طرح خواہ مخواہ غلط باتیں کر کے مرشد زادے پر بہتان اور اتہام لگائیں۔"

حیات خاں نے بادشاہ کے بار بار کے اصرار پر بڑے قوی دلائل سے شاہ عالم کی بے گناہی ثابت کر دی تھی مگر بادشاہ کے دل میں جو کھٹک پیدا ہو گئی تھی' نہیں نکلی۔



اس دن اورنگ زیب نے بخشیوں اور محرم راز مقربوں کو خفیہ طور پر ہدایت کر دی تھی کہ وہ متعدد کارگزار آدمیوں کے ساتھ چوکی خانے میں حاضر رہیں اسی لیے اس نے چاہا کہ شاہ عالم کو لانے کے لیے ایک فوج حیات خاں کے ساتھ بھیج دی جائے۔

اس پر حیات خاں نے عرض کیا۔ "فوج کی کیا ضرورت ہے! اگر بادشاہ سلامت حکم دیں تو بارگاہ والا سے ایک چیلا جا کر شہزادے کو اپنے ساتھ لے آئے گا کیونکہ شہزادے کے دل میں یہ بہ جز اطاعت کچھ اور نہیں"

۸ ربیع الثانی کو جبکہ اورنگ زیب کو تخت نشین ہوئے انتیس سال ہوئے تھے' حیات خاں کی گزارش کے مطابق ایک چیلے کو حکم ہوا کہ شاہ عالم کو خدمت شاہی میں حاضر کر دے۔ شاہ عالم یہ حکم ملتے ہی بلا توقف باپ کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ ابھی وہ بادشاہ کو تسلیمات بجا لا کر بیٹھا ہی تھا کہ جمدۃ الملک اسد خان شاہ عالم کے پاس آیا اور آہستہ سے اس کے کان میں کہا۔

"بادشاہ کے حکم سے چند باتیں آپ سے خلوت میں کہنے کی ہیں"

شہزادہ شاہ عالم خاموشی سے اٹھ کر اس کے ساتھ ہو گیا اسد خاں‘ شہزادے کو اس مقام پر لے آیا جو پہلے ہی مقرر کر لیا گیا تھا۔ وہاں پہنچ کر شاہ عالم سے ہتھیار اتارنے کا مطالبہ کیا گیا۔

”مگر کیوں؟“

شاہ عالم حیرت سے بولا۔

”بادشاہ کا حکم ہے کہ آپ چند روز دنیا کے کاروبار سے یکسو ہو کر عبادت الٰہی میں مشغول رہیں“

اسد خاں نے جواب دیا۔

شاہ عالم سمجھ گیا کہ اس پر عتاب شاہی نازل ہوا ہے۔ چاروں طرف اسے مسلح سپاہی نظر آ رہے تھے۔ ان سپاہیوں کا تعلق اورنگ زیب کے خاص محافظ دستے سے تھا۔ بہ جز اطاعت حکم کے اور کوئی چارہ نہ تھا‘ سو شاہ عالم کو گرفتار کر کے قید خانے میں ڈال دیا گیا۔

چند روز بعد اورنگ زیب نے قید خانے میں شاہ عالم کے پاس پیغام بھجوایا کہ تم اگر چاہا تو اپنے قصوروں کا اقرار کر کے معافی کی درخواست ہماری خدمت میں بھیج سکتے ہو‘ ہم تمہیں معاف کر دیں گے‘ مگر شاہ عالم کا دل اور ضمیر صاف تھا‘ پھر بھلا وہ کس طرح قصور کا اعتراف کر لیتا! اس نے قبول و اعتراف سے انکار کر دیا اور جواب میں کہلوایا۔

”اگرچہ میں بہ باطن اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ اور والد بزرگوار کا قصور وار سمجھتا ہوں مگر بظاہر مجھ سے کوئی ایسا قصور سرزد نہیں ہوا جس پر مجھے معافی طلب کرنا پڑے“

اس جواب پر اورنگ زیب اور بھی چراغ پا ہو گیا اور شاہ عالم کے متعلق حکم دیا۔

”اس بدبخت کو اب حجامت بنوانے اور ناخن کٹوانے کی رعایت بھی نہ دی جائے‘ اسے اچھی غذا‘ پسندیدہ لباس پہننے اور ٹھنڈے پانی سے محروم کر

دیا جائے!“

قلعہ گولکنڈہ کا محاصرہ خاصی طوالت اختیار کر گیا تھا۔ قلعے والے رات دن مسلسل گولہ باری کر رہے تھے۔ کسی وقفے کے بغیر بندوقوں سے گولیاں برس رہی تھیں اور توپوں کے دہانے آگ اگل رہے تھے۔ بارود کے دھوئیں سے ایسے بادل چھائے رہتے تھے کہ دن پر بھی رات کا گمان ہوتا تھا۔ کوئی دن ایسا نہیں گزرتا تھا جب مغل سپاہی نہ مارے جاتے ہوں۔ اورنگ زیب کے علم میں یہ بات آ چکی تھی کہ شہزادہ اعظم شاہ اپنے بھائی شاہ عالم سے نفاق و دشمنی رکھتا ہے۔ اورنگ زیب نے اسی لیے اسے اجین و اکبر آباد کے بندوبست کی خاطر لشکر سے رخصت کر دیا۔

ماہ شعبان کے وسط میں دو تین دن تک اس شدت کی بارش ہوئی کہ مغل لشکر گاہ میں جل تھل ہو گیا۔ خیمے پانی کی سطح پر بلبلے بن کر تیرنے لگے۔ ساری مورچہ بندی تہس نہس ہو گئی‘ دمدمے گر پڑے اور نقب میں پانی بھر گیا۔ پانی اس طرح ندی نالے بن کر نکلا کہ توپ خانہ تیرنے لگا۔ کیچڑ‘ پانی اور سیلاب میں نقل و حرکت دشوار ہو گئی۔

قلعے کے اندر اس وقت بانو اپنے جسم پر ہتھیار سجا رہی تھی۔ اس کا باپ عبدالرزاق اور وہ خود ابھی ابھی تانا شاہ سے مل کر آئے تھے۔ بانو کے خیال میں مغل لشکر پر حملہ کرنے کے لیے یہ موقع بہت اچھا تھا۔ فوج کو تیاری کا حکم دے دیا گیا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد قلعے کا بڑا دروازہ کھلا۔ آگے آگے بانو اور عبدالرزاق کے گھوڑے تھے۔ اس لشکر نے اچانک مغل فوج پر حملہ کر دیا۔

مغلوں کو وہم و گمان بھی نہیں تھا کہ اس وقت قطب شاہی فوج حملہ کر دے گی اس لیے ان کے پیر اکھڑ گئے۔ سلیم خان حبشی جو مغل فوج میں خود کو بڑا بہادر اور دلیر سمجھتا تھا‘ اپنے دستوں کے ساتھ مقابلے پر جم گیا مگر جب اس نے دیکھا کہ اب کسی بھی طرح اس گرداب بلا سے نکلنا ممکن نہیں بھاگ کھڑا ہوا اور ایک غار میں چھپ گیا۔ اس کے دستوں کے سپاہیوں کو تہ تیغ کر دیا

گیا۔ مغل فوج میں صف شکن نامی ایک سالار قلعے کی تسخیر کے لیے سب سے زیادہ کوشش کر رہا تھا' مگر جب بانو نے اس کے مورچے پر حملہ کیا تو اسے شکست ہوگئی اور وہ زخمی ہوگیا۔ زخمی ہونے کے باوجود اس نے بڑی ہوشیاری سے خود کو زخمیوں اور لاشوں میں چھپا لیا اور اس تدبیر سے اپنی جان بچالی۔ جمشید نامی ایک فوجی افسر بھی بہادری کی بڑی ڈینگ مارتا تھا مگر جب قطب شاہی فوج نے حملہ کیا تو مقابلے کی تاب نہ لاکر بھاگ کھڑا ہوا۔ قلعے والوں نے غیرت خاں میر آتش پر حملہ کرکے اسے بھی میدان سے بھگا دیا۔ جب وہ فرار ہو رہا تھا تو اس کی بدقسمتی سے بانو نے اسے دیکھ لیا۔ اس نے اپنے سپاہیوں کو اشارہ کیا۔ سپاہیوں نے دونوں جانب سے اسے گھیر لیا۔ پھر بھی وہ ایک غار کی طرف لپکا اور وہاں پناہ لے لی۔ غار میں چونکہ غیرت خاں کیچڑ اور پانی میں بری طرح آلودہ ہوگیا تھا اس لیے قطب شاہی سپاہی اسے پہچان نہ سکے کہ وہ مغل لشکر کے توپ خانے کا افسر اعلی ہے مگر جب اسے بانو کے سامنے پیش کیا گیا تو بانو نے اسے پہچان لیا۔ اسی طرح مغل لشکر کے بارہ منصب دار زندہ گرفتار کرلیے گئے۔

بانو تمام مغل اسیروں کو اپنے قلعے میں لے آئی اور انہیں تاناشاہ کے سامنے پیش کر دیا۔ دربار میں اس وقت شرزہ خاں بھی موجود تھا۔ اس نے کہا کہ ان سب کو تہ تیغ کر دیا جائے اور ان کے سر اورنگ زیب کی خدمت میں بھیج دیئے جائیں۔

اس سے بانو نے اختلاف کیا۔ تاناشاہ نے فی الحال ان تمام قیدیوں کو قید خانے میں بھیج دیا۔ خلوت ملتے ہی بانو نے تاناشاہ سے کہا

"یہ موقع بڑا غنیمت ہے کہ مغل بادشاہ سے مصالحت کی بات کرلی جائے۔ تمام مغل منصب داروں کو خلعت و انعام دے کر مغل بادشاہ کے پاس بھیج دیا جائے اور انہی کے ساتھ صلح کا پیغام ارسال کر دیا جائے۔

تھوڑے سے بحث و مباحثے کے بعد تاناشاہ نے بانو کی تجویز قبول کرلی اور پھر دوسرے ہی دن اس تجویز پر عملدر آمد کر دیا گیا۔ بانو کے مشورے پر

اورنگ زیب کو جو عرضداشت روانہ کی گئی' اس کا مفہوم کچھ اس طرح تھا۔

"میں خود کو بارگاہ والا کا عاجز اور جاں نثار بندہ سمجھتا ہوں۔ اس بندہ عاجز سے جو بھی قصور دانستہ یا نادانستہ سرزد ہوئے تھے' یہ اس کی سزا بھگت چکا ہے۔ اب یہ غلام معافی اور فضل و کرم کا خواست گار ہے دوسری بات یہ کہ اگر حضور نے غلام کے قصور معاف کر دیئے تو اس صورت میں قلعہ گولکنڈہ حضور کے کارگزاروں کے قبضے میں آجائے گا۔ پھر حضور خیرو عافیت کے ساتھ دارالخلافہ لوٹ سکتے ہیں۔ تب لازما" حضور اس تباہ برباد ملک کا انتظام کسی نہ کسی شخص کے سپرد کریں گے ہی۔ امیدوار ہوں کہ آپ یہ ذمہ داری میرے ہی سپرد فرمائیں کیونکہ آپ جس امیر کو بھی یہاں مقرر فرمائیں گے' اس کے اور اس کے ہمراہیوں کے منصب اور دوسرے مدوں میں جو رقم خرچ ہوگی' وہ اس سرزمین کے حصول سے زیادہ ہو جائے گی۔ پھر وہ امیر بڑی دقتوں کے بعد اس ملک کو آباد کرسکے گا۔ جواب ویرانہ اور کھنڈر بن چکا ہے۔ یہاں کا نظم و نسق بھی بڑی مشکل ہی سے درست ہوسکے گا کیونکہ فوجوں کی آمدورفت کی وجہ سے یہ علاقہ ایسا تباہ ہوا ہے کہ سات آٹھ سال میں کہیں جاکر آباد ہوسکے گا۔ ان حالات میں ظاہر ہے کہ یہ بندہ عاجز بارگاہ شاہی میں اب تک جو کچھ پہنچاتا رہا ہے' یہاں متعین کیا

جانے والا کارگزار اس کی وصولی میں ناکام رہے گا۔ اگر حضور اس عاجز کی التماس قبول فرمائیں تو واپسی کے بعد سرحد تک پہلی منزل پر جہاں بھی حضور کا قیام ہوگا' میں ایک کروڑ روپیہ نذر پیش کروں گا۔ ہر یورش کے عوض میں حضور کے یہاں پر قدم رنجہ فرمانے کے سلسلے میں ایک کروڑ روپیہ خیر مقدم کے طور نچھاور کرنے کے لیے تیار ہوں۔ یہ خدمات میں اس لیے انجام دینا چاہتا ہوں کہ اب مزید مسلمانوں کی خوں ریزی نہ ہو اور آپ کی مظفر فوج کے سپاہی اپنے اہل و عیال سے زیادہ عرصے تک جدا نہ رہیں۔ اگر حضور بندے کی درخواست قبول نہ کریں اور بندگان عالی کو زیادہ وقت منظور ہو تو پھر میں لشکر شاہی کی سہولت کے لیے چھ سو ہزار من غلہ حضور کی خدمت میں بھجوادوں۔"

اس پیغام کے جواب میں اورنگ زیب عالمگیر نے کہا

"ابو الحسن ہمارے حکم اور فرمان کا بندہ ہے تو وہ دست بستہ حاضر ہو جائے یا اس کی گردن میں رسی ڈال کر ہمارے سامنے حاضر کر دیا جائے۔ پھر جو کچھ ہماری مروت کا تقاضا ہوگا عمل میں آجائے گا۔"

پھر اورنگ زیب کے حکم پر تین برجوں کے نیچے نقب پہنچا دی گئی اور انہیں بارود سے بھر دیا گیا مگر قلعے والوں کو بروقت اس کی خبر ہو گئی انہوں نے بارود نکال کر سرنگوں میں پانی بھر دیا۔ اس طرح اورنگ زیب کی یہ تدبیر بھی

رائیگاں گئی اور بارودی سرنگیں پھٹیں بھی تو ان سے مغل فوج ہی کو نقصان ہوا۔ بانو کے حکم پر ان سرنگوں کے اس حصے میں بارود رہنے دی گئی تھی جو قلعے کے باہر تھا۔

اورنگ زیب کو قطب شاہی سپہ سالار عبدالرزاق کے بارے میں بتایا گیا کہ اسی کی جانثاری دلیری اور بہادری کی وجہ سے اب تک آٹھ ماہ کی مدت گزر جانے کے باوجود قلعہ فتح نہیں ہوا۔ کافی غور و فکر کے بعد اورنگ زیب نے عبدالرزاق کو ایک خفیہ پیغام بھیجا۔ کہ اگر تم قلعے کا دروازہ کھول دو گے اور ہم سے مل جاؤ گے تو ہم تم پر اپنی عنایات کا دروازہ کھول دیں گے۔ ہم تم سے عہد کرتے ہیں کہ اگر تم نے ہم سے وفاداری کا ثبوت دیا تو دیگر انعام و اکرام اور خلعت کے ساتھ تمہیں چھ ہزاری کا منصب بھی عطا کر دیں گے۔ عبدالرزاق یہ پیغام لے کر قلعے کے ایک برج پر چڑھ گیا اور بہ آواز بلند مغل سپاہیوں کو مخاطب کیا۔

"سنو کہ تمہارا بادشاہ مجھے غداری پر آمادہ کر رہا ہے مگر میں اپنے ولئ نعمت کا نمک خوار ہوں اسی لیے اس پیشکش کو ٹھکراتا ہوں" پھر اس نے اورنگ زیب کے پیغام کو ٹکڑے ٹکرے کر کے نیچے پھینک دیا۔ اس کے بعد عبد الرزاق بولا۔

"اپنے بادشاہ سے کہہ دینا کہ یہ جنگ میری دانست میں کربلا کی لڑائی کے مشابہ ہے۔ جب تک عبدالرزاق کی جان میں جان ہے' بائیس ہزار کے اس لشکر میں شامل نہیں ہوگا جس نے پہلے امامؑ مظلوم کے ہاتھ پر بیعت کی تھی' پھر امامؑ ہی پر تلوار کھینچ لی تھی۔ میں تو دوسری طرف بہتر آدمیوں کی جمعیت میں ہی شریک رہ کر دنیا و آخرت کی سرخروئی حاصل کرنے کا امیدوار ہوں"

جب عبدالرزاق کی بابت یہ خبر اورنگ زیب کو سنائی گئی تو بہ ظاہر اس نے غصے کا اظہار کیا مگر بہ باطن عبدالرزاق کی نمک حلالی پر آفرین ہی کہا۔

عبدالرزاق کی طرف سے مایوس ہو کر اورنگ زیب نے شرزہ خاں پر

جال پھینکا اور شرزہ خاں انعام و اکرام کے لالچ میں آگیا۔ وہ در پردہ مغل لشکر سے مل گیا۔ اس وقت وہ قلعہ گولکنڈہ کے ایک دروازے پر جو "کھڑکی" کے نام سے مشہور تھا' صاحب اختیار کماں دار تھا۔ اس کا ماتحت عبد اللہ خاں تھا۔ شرزہ خاں نے اسے بھی اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ اسی دروازے کے قریب سے مغل سپاہی زینے لگا کر فصیل پر چڑھ گئے شرزہ خاں نے ان کی رہنمائی کی اور وہ قلعے میں داخل ہوگئے۔

جس وقت حملہ آور مغل سپاہی کے صدر دروازے پر اندر کی طرف پہنچ گئے تھے اور محافظوں کو گرفتار کرکے دروازہ کھولنے کی فکر میں تھے' عبدالرزاق کو یہ اطلاع ملی۔ اس نے بانو کو جگایا اور پھر جلدی جلدی جسم پر ہتھیار سجا کر گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر سوار ہوگیا۔ اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ گھوڑے پر زین کس سکتا۔ بانو سے اس نے اپنے پیچھے آنے کے لیے کہا تھا۔ عبدالرزاق کے ساتھ گنتی کے چند سپاہی تھے۔ وہ انہیں لے کر قلعے کے صدر دروازے پر پہنچا' مگر اس وقت تک دروازہ کھول دیا گیا تھا۔ اور مغل سپاہی تیزی کے ساتھ قلعے میں داخل ہو رہے تھے۔ عبدالرزاق مقابلے پر ڈٹ گیا۔ وہ دریا کے مقابلے پر ایک قطرے کی مانند تھا۔ ذاتی طور پر وہ اتنا بہادر اور دلیر تھا کہ اس نے مختصر سپاہی ساتھ ہونے کے باوجود مغل فوج کا راستہ روک دیا۔ عبدالرزاق کو تلواروں اور نیزوں کے اتنے کاری زخم آئے کہ وہ سر سے پاؤں تک خون میں نہا گیا پھر بھی قلعے سے نہ ہٹا۔ بارہ زخم تو صرف اس کے چہرے پر لگے تھے۔ چہرے کی کھال' پیشانی' آنکھوں اور ناک پر سے اتر گئی تھی۔ آنکھ پر بھی بڑا گہرا گھاؤ لگا تھا عبدالرزاق کے جسم پر تو ستاروں کی طرح زخموں کے نشان تھے ہی اس کا گھوڑا بھی بری طرح زخمی ہوگیا تھا اور لرز رہا تھا۔ آخر عبدالرزاق کے ہاتھ سے گھوڑے کی باگ چھوٹ گئی مگر وہ پھر بھی اپنے جسم کو گھوڑے پر سنبھالے رہا اور نیچے نہ گرا۔ گھوڑا اسے لیے ہوئے سپاہیوں کے نرغے سے نکل گیا اور قلعے کے قریب ہی ایک باغ میں جا کر ٹھہر گیا۔ اس باغ کا نام باغ نگینہ

تھا۔ عبدالرزاق بہ مشکل گھوڑے سے اتر کر ایک پیڑ کے نیچے تقریباً بے سدھ ہو کر گر پڑا اور پھر بے ہوش ہوگیا۔

ادھر بانو چند سپاہیوں کے ساتھ شرزہ خاں کے پاس پہنچی۔ عیار شرزہ خاں بہ ظاہر اپنے سپاہیوں کی بھاری جمعیت کے ساتھ بانو کے پیچھے چل دیا۔ اس نے سوچا تھا کہ عین موقع پر بانو کو دھوکا دوں گا۔

بانو مارتی کاٹتی قلعے سے باہر آگئی اور مردانہ وار مغل سپاہیوں پر حملے کرنے لگی۔ اس وقت تک خود اورنگ زیب عالمگیر بھی میدان میں جنگ میں آچکا تھا۔ بانو مغل لشکر میں جدھر بھی نکل جاتی کہرام برپا کر دیتی۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ اب تک شرزہ خاں بھی اس کے شانہ بہ شانہ لڑ رہا تھا۔ خود اورنگ زیب نے بانو کی جرات اور بہادری کا مشاہدہ کیا۔ جنگ کے دوران میں اس نے اپنے ایک خاص دستے کو حکم دیا کہ کسی صورت اس شہسوار کو بچ کر نہ جانے دیا جائے۔ بانو اپنے دلیر سپاہیوں کے ساتھ صفوں پر صفیں الٹتی ہوئی اتنی آگے بڑھ گئی۔ کہ اسے عقب کا خیال نہ رہا۔ شرزہ خاں اس کے عقب میں لڑ رہا تھا۔ بانو ہر حال میں اورنگ زیب تک پہنچنے کا قصد کر چکی تھی جو قلب لشکر میں تھا۔ اسے خبر نہیں تھی کہ اس کا باپ عبدالرزاق پسپا ہو چکا ہے۔ شرزہ خاں کسی ایسے ہی موقع کی تلاش میں تھا۔ اس سے پہلے کہ مغل افواج اسے اور اس کے سپاہیوں کو نرغے میں لے لیتیں' اس نے راہ فرار اختیار کرلی۔ عین حالت جنگ میں بانو کو یہ خبر ملی۔ اس نے بڑے جوش میں کہا

"پروا نہ کرو اور لڑتے رہو! اورنگ زیب کا محافظ دستہ اب زیادہ دور نہیں۔ اگر ہم نے اورنگ زیب کا سینہ چھید دیا تو یہ جنگ فیصلہ کن ثابت ہوگی۔ جب ایک بار قدم آگے بڑھ جائیں تو پیچھے ہٹنا بزدلی ہے اور یقیناً تم میں سے کوئی بزدل نہیں۔ بانو کے پر جوش الفاظ نے بڑا اثر کیا اور اس کے سپاہی موت سے بے پروا ہو کر لڑنے لگے۔



اگر اس وقت عقب میں شرزہ خاں بھی ہوتا اور فرار نہ ہوگیا ہوتا تو شاید بانو اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتی۔ تاریخ کا دھارا پھر کسی اور رخ بہتا' مگر ابھی اورنگ زیب عالمگیر کا آخری وقت نہیں آیا تھا' سو بانو اپنے جیالے سپاہیوں سمیت بہت جلد نرغے میں آگئی۔ اس کے لیے اورنگ زیب نے حکم دیا تھا کہ اسے ہر حال میں زندہ گرفتار کیا جائے۔ اس حکم کی تعمیل کے لیے مغل لشکر کو بھاری جانی نقصان اٹھانا پڑا' لیکن اورنگ زیب کا ایک امیر اسے زندہ گرفتار کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ بانو اور اس کے سپاہیوں کو پابند زنجیر کر کے زندان میں ڈال دیا گیا۔ اسی دوران بانو کو علم ہوا کہ مغل تاجدار اورنگ زیب عالمگیر جنگ جیت گیا ہے اور قطب شاہی حکمران ابو الحسن تانا شاہ گرفتار کیا جا چکا ہے تو اسے شکست کا بہت دکھ ہوا۔

فتح کے دوسرے دن صبح کچھ لوگ باغ نگینہ سے ہو کر گزر رہے تھے کہ ان کی نگاہ لہولہان اور بے ہوش عبدالرزاق پر پڑی۔ گھوڑے کی نشانی اور دوسری علامتوں سے معلوم ہو گیا کہ وہ قطب شاہی فوج کا سپہ سالار عبدالرزاق

ہے۔ وہ اس قدر زخمی ہو جانے کے باوجود ابھی مرا نہیں تھا' ابھی جان باقی تھی۔ لوگوں نے اسے چارپائی پر ڈال کر گھوڑے اور ہتھیاروں کے ساتھ قلعے میں پہنچا دیا جس پر اب مغلوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ عبدالرزاق کے ملازمین اس کا علاج اور مرہم پٹی کرنے لگے۔

اورنگ زیب عالمگیر قلعے میں آ چکا تھا۔ قلعہ فتح ہونے کی خوشی میں شہزادہ شاہ عالم کو بھی رہا کر دیا گیا تھا۔ اس وقت اورنگ زیب عالمگیر اس تخت پر بیٹھا ہوا تھا۔ جس پر قلب شاہی حکمراں ابوالحسن تانا شاہ بیٹھا تھا۔ اس کے قریب ہی دائیں جانب کی صف میں پہلی نشست شہزادہ شاہ عالم کی تھی۔ اورنگ زیب کی دیرینہ کی خواہش پوری ہو گئی تھی۔ دکن فتح ہو چکا تھا مگر اس فتح کی اسے بڑی قیمت ادا کرنا پڑی تھی۔ دکن کی زمین پر بڑا خون بہا تھا۔

دربار میں جب اورنگ زیب کے حکم پر قیدیوں کو پیش کیا گیا تو ان میں بانو کو دیکھ کر شہزادہ شاہ عالم چونک اٹھا۔ وہ بانو کو پہچان گیا تھا۔ اورنگ زیب نے پابہ زنجیر قیدیوں پر نگاہ قہر ڈالی اور کہا۔ "ہم سے ٹکرانے کا انجام تم نے دیکھا!" پھر اس نے براہ راست بانو کو مخاطب کیا۔ "قریب آ اے میرے دشمن کہ میں تیرا زندہ چہرہ دیکھ کر سکون!"

زنجیریں کھڑکھڑائیں اور بانو آگے بڑھ کر تخت کے قریب کھڑی ہو گئی۔ اس کا سر ندامت سے جھکا ہوا تھا۔

اورنگ زیب کی آواز پھر بلند ہوئی۔ "اے دشمن نوجوان! ہر چند کہ ہم تیری دلیری اور جرات سے خوش ہوئے مگر یہ دلیری اور جرات صرف ہمارا حق ہے۔ ہم اسے اپنے کسی دشمن میں برداشت نہیں کر سکتے' سو ہم تیرے اور تیرے ساتھیوں کے قتل کا حکم دیتے ہیں۔"

اپنے قتل کا حکم سننے کے بعد بھی بانو کا چہرہ پر سکون رہا۔ وہ بڑی دلیری سے چند قدم تخت کی طرف بڑھی۔ اسی کے ساتھ مغل سرداروں کے ہاتھ اپنی اپنی تلواروں کے قبضوں پر پہنچ گئے۔ بانو چند قدم آگے بڑھ کر رک گئی اور اس

نے براہ راست اورنگ زیب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ پھر وہ اورنگ زیب عالمگیر ایسے باجبروت بادشاہ کے روبرو بڑی دلیری سے مردانہ آواز میں بولی۔ "مجھے بادشاہ سے کچھ عرض کرنا ہے۔"

اس کی بات سن کر اورنگ زیب نے اسے حیرت سے دیکھا۔ اب تک کسی کو یہ جرات نہ ہوئی تھی کہ سزائے موت سننے کے بعد اس کے روبرو کچھ کہہ سکتا۔ اورنگ زیب کو اس کے پرسکون لہجے پر بھی شدید حیرت تھی۔ موت کا حکم سنائے جانے کے بعد اس نے بڑے بڑے جری اور جواں مردوں کے چہروں پر زردی پھیلتے دیکھی تھی' لیکن بانو کے چہرے سے اس کا اظہار نہیں ہوا تھا۔ بانو کا ادا کیا ہوا ایک سادہ فقرہ کچھ ایسا موثر نہ تھا اور اورنگ زیب عالمگیر ایسے سخت مزاج بادشاہ کے آگے اس قدر وقعت نہیں رکھتا تھا' مگر یہ سادہ سا فقرہ جس لہجے میں ادا کیا گیا تھا اس نے اورنگ زیب کو چونک اٹھنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس نے قدرے توقف سے بانو کو مخاطب کیا۔

"بول کیا کہتا ہے؟"

بانو یہ سن کر نہایت متانت سے بولی۔ "اے بادشاہ! اس وقت میں جو کچھ عرض کروں گا' سراسر صداقت اور آزادی پر مبنی ہو گا۔ نہ میں کسی کی جھوٹی تعریف کروں گا نہ کسی کے لیے میرے منہ سے جھوٹے الفاظ نکلیں گے۔ میری التجا ہے کہ جب تک میں اپنے مافی الضمیر کا اچھی طرح اظہار نہ کر لوں' مجھے تقریر کرنے سے نہ روکا جائے۔"

بانو کی اس پر مغز اور عاقلانہ بات نے دربار کے ندیموں اور تمام ارکان سلطنت بلکہ خود اورنگ زیب پر وہ اثر ڈالا کہ سب کے سب دم بہ خود رہ گئے۔ وہ حیرت سے سوچنے لگے کہ یہ کوئی بڑا ہی دلیر اور بے باک نوجوان ہے جو اورنگ زیب ایسے سخت گیر بادشاہ کے سامنے اتنی بے خوفی اور سختی سے گفتگو کر رہا ہے۔ اس کی باتوں میں ذرا بھی تواضع اور خلق نہیں پایا جاتا۔ اس وقت مغل دربار کی عجیب و غریب کیفیت تھی۔ سارے دربار پر خاموشی اور سناٹا

چھایا ہوا تھا۔ ہر شخص جیسے تصویر بنا بیٹھا تھا۔ اورنگ زیب کو خود بانو کے لہجے اور بے خوف گفتگو پر سخت حیرت تھی۔ آخر تھوڑی دیر سکوت کے بعد اورنگ زیب نے گردن اٹھائی اور بولا۔ "معاملہ اگر صرف تیرا اور میرا ہے تو پھر ان تیرے ساتھی قیدیوں کی یہاں ضرورت نہیں۔ بول کیا انہیں واپس زنداں میں بھجوا دیا جائے؟"

"ہاں یہاں ان کی موجودگی ضروری نہیں۔" بانو نے بلا جھجک جواب دیا۔

اورنگ زیب کے اشارے پر قیدیوں کو وہاں سے لے جایا گیا۔ قیدی چلے گئے تو اورنگ زیب نے کہا۔ "تو جو کچھ کہے گا' میں اسے سنوں گا اور تجھے تقریر سے روکا نہیں جائے گا۔"

اورنگ زیب کی اس اجازت نے بانو کو اور بھی دلیر کر دیا۔ وہ پوری جرات اور بے باکی کے ساتھ اورنگ زیب سے مخاطب ہوئی۔ "اے مغل تاجدار! تو نے دکن پر چڑھائی کر کے صدہا بندگان خدا کا خون بہایا اور تیرے وحشی لشکر کی خوں ریز تلواروں نے بڑی خوں خواری کے ساتھ ہزاروں بے گناہوں کے تن' بے سر کر دیئے۔ خوب سمجھ لے کہ یہ ایک ایسا گناہ ہے جو قیامت تک تیرے گلے کا ہار بنا رہے گا اور بھی معاف نہ ہو گا۔ تو نے نہایت بے رحمی اور سخت بیدردی سے دکن والوں کو کچل دیا اور اسے اپنی فتح سمجھا۔ تو نے بے گناہ اہل دکن کے معصوم اور لاڈلے بچوں کو یتیم اور ناکردہ گناہ عورتوں کو بیوہ کر دیا۔ میں تجھے یقین دلاتا ہوں کہ تو نے بہادر کسیوں کا خون نہیں بہایا' ان کے خون کے بہتے دریا میں اپنے گھوڑے کے سم نہیں بھگوئے بلکہ تو نے دکن میں مسلمانوں کا قتل عام کر کے' مسلم حکومتوں کو ختم کر کے اسلام کی قوت کو شدید دھچکا پہنچایا ہے۔ کیا مسلمانوں کو اس بے رحمی اور ظلم کے ساتھ قتل کرنا جائز ہے! قطب شاہی فرماں روا ابو الحسن تاناشاہ نے تجھے کئی بار صلح کا پیغام بھیجا اور اپنی اطاعت کا یقین دلایا۔ بے گناہ مخلوق کی جان بچانے

کے لیے وہ تجھ ایسے متکبر اور نخوت پسند شخص سے بہ لجاجت پیش آیا' مگر تو نے اس پر بالکل توجہ نہیں کی بلکہ تو نے جواب میں کہلوایا کہ اس کی گردن میں رسی ڈال کر ہمارے سامنے حاضر کر دیا جائے۔ اس نے تیرے قیدیوں کی جان بخشی کی اور تو نے اس کے قیدیوں کو سزائے موت سنائی! کیا تجھے نہیں معلوم کہ ایک دن تیری عمر کا پیمانہ لبریز ہو کر چھلک جانے والا ہے! تجھے اس عالم سے گزر کر رب الافواج کے حضور حاضر ہونا ہے۔ پھر تو ہی بتا جب وہ ان مظلوموں کی بابت تجھ سے عتاب آمیز سوال کرے گا تو تو کیا جواب دے گا! میں اس بے نتیجہ امر کی بابت زیادہ بحث کرنا نہیں چاہتا' صرف اتنا اور عرض کروں گا کہ بھلا آج تک کبھی مظلوم قیدیوں پر بہادروں کی تلواریں اٹھی ہیں! ہم بے بس قیدی ہیں۔ ہمارے ہاتھ پاؤں زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ ایسی حالت میں یہ نہایت ہی بزدلانہ بات ہے کہ تو ہماری گردن مارنے کا حکم دے رہا ہے۔"

ان الفاظ کے ختم ہوتے ہی بانو اپنے دونوں ہاتھ' سر تک لے گئی۔

دوسرے ہی لمحے بانو کا آہنی خود زمین پر آ رہا۔ اب تک وہ مردانہ آواز میں گفتگو کرتی رہی تھی' لیکن خود اتر جانے اور پشت پر دراز سیاہ زلفیں بکھر جانے کے بعد اس کی آواز بدل گئی۔ اب وہ اپنی اصل نسوانی آواز میں بول رہی تھی' مگر اب اس کا لہجہ بڑا کٹیلا تھا۔

وہ کہہ رہی تھی۔

"اے مغل تاجدار دیکھ کہ میں ایک عورت ہوں۔ تو مجھے دیکھ کر ہی بخوبی اس بات کا اندازہ لگا سکتا ہے کہ جس قوم کی عورتیں ایسی نڈر اور بہادر ہوتی ہیں' اس کے مرد کیسے بے خوف اور دلیر ہوں گے! اور سن اے بادشاہ! میں کسی کم اصل خاندان سے نہیں۔ میرا باپ ایک باعزت ہندو راجپوت خاندان کا فرد تھا جس نے خود اپنی مرضی سے اسلام قبول کیا۔ میں اسی نو مسلم راجپوت باپ کی بیٹی ہوں جو قطب شاہی فوجوں کا سالار تھا اور جسے دنیا عبدالرزاق کے نام سے جانتی ہے۔ میرے عظیم باپ نے مجھے بہ جبر اسلام قبول

کرنے پر آمادہ نہیں کیا بلکہ میں نے خود مطالعہ کر کے اپنی مرضی و منشا سے یہ دین اختیار کیا۔ میرے باپ نے میرا نام امتہ الحبیب رکھا اور پیار میں مجھے بانو سے پکارا اور پھر یہی میرا نام ہو گیا۔

بانو کو قدرت نے صورت اور آواز ہی ایسی دی تھی کہ دل اس کی طرف کھنچے لگتے تھے۔ اس کی نسوانی آواز میں بلا کی کشش تھی۔ ایسی صورت میں ممکن ہی نہ تھا کہ دیکھنے والا اسے دیکھتا ہی نہ رہ جائے۔ وہ تخت شاہی سے زیادہ دور نہیں تھی۔ کچھ ہی فاصلے پر دائیں جانب شہزادہ شاہ عالم اسے سحر زدہ سا ہو کر دیکھ رہا تھا۔

○--------○--------○

اورنگ زیب' بانو کی بے خوف اور گستاخانہ گفتگو پر حیران تھا۔ اس کے دل پر یہ سن کر اثر ہوا تھا کہ بانو ایک ہندو راجپوت خاندان سے تعلق رکھتی تھی اور اپنی مرضی سے مسلمان ہوئی تھی۔ اب تک ایسا نہ ہوا تھا اس نے کوئی حکم دے کر واپس لیا ہو۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اورنگ زیب ایسے سخت گیر بادشاہ کی بابت اور خود اس کے سامنے ایسے بے باکانہ اور سخت کلمات ادا کیئے گئے تھے اور یہ بھی پہلا موقع تھا کہ اس نے تحمل کا ثبوت دیا تھا۔

ذرا دیر بعد اورنگ زیب جب نرم آواز میں بولا تو اہل دربار ششدر رہ گئے۔ اس نے بانو سے کہا۔ "اے بہادر اور دلیر خاتون! تو نے جو کچھ اپنی تقریر میں کہا' سب درست اور بجا ہے' لیکن مختلف فتوحات کی کشش نے وہ نئے نئے سامان پیدا کر دیئے ہیں جنہوں نے اصل واقعات اور حقائق کو ہمارے نظروں سے اوجھل کر دیا ہے۔ ہمیں تیری اس بات سے قطعی اتفاق ہے کہ پابہ زنجیر قیدیوں کو قتل کرنا بہادری نہیں' بزدلی ہے۔ یقین کر کہ ہم بزدل نہیں' مگر ہم جو حکم دے چکے ہیں' اسے واپس نہیں لے سکتے کہ آج تک ایسا نہیں ہوا۔

تو ہماری اس بات پر بھی یقین کر کہ تیری تقریر نے ہمارے دل پر بڑا اثر کیا ہے۔ ہم تیرا اور تیرے جان نثار ساتھیوں کا خون معاف کر دینا چاہتے تھے' لیکن ہماری زبان سے نکلے ہوئے الفاظ قانون کا درجہ رکھتے ہیں ایسا قانون جسے بدلا نہیں جا سکتا! بس اب ایک ہی راستہ ہے کہ ہم وہ فیصلہ سنا دیں جس پر عمل در آمد کے بعد تو ہمیں بزدلی کا طعنہ نہ دے سکے اور ہمارے حکم کی تعمیل بھی ہو جائے۔

اس کے بعد اورنگ زیب عالمگیر نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ اس فیصلے کی رو سے ہر قیدی سپاہی کو اپنی زندگی بچانے کا موقع مل گیا تھا۔ ہر قیدی سپاہی کے مقابل ایک مغل سپاہی کو آنا تھا اور اس سے موت و حیات کی جنگ لڑنا تھی۔ ہر قیدی کو اورنگ زیب کی طرف سے اتنے ہی ہتھیار فراہم کیے جانا تھے جتنے ایک مغل سپاہی کے پاس تھے۔ یہ موت اور زندگی کا کھیل تھا۔ جو قیدی بھی اپنے حریف مغل سپاہی کو قتل کر دیتا' اسے آزادی مل جاتی۔ یہ خوفناک کھیل کچھ ہی دیر کے بعد قلعے کے وسطی میدان میں کھیلا جانا تھا۔

اورنگ زیب کے فیصلے میں جو سب سے اہم بات تھی' اسے سبھی نے محسوس کیا۔ اس نے بانو کو عام قیدیوں میں شمار نہیں کیا تھا۔ اس پر اورنگ زیب کے فیصلے کا اطلاق نہیں ہوتا تھا۔ بانو ایسی حسین و جری عورت کو اس نے انتہائی دانش مندی کے ساتھ اپنی دانست میں ایک بڑے خطرے اور امتحان سے بچا لیا تھا۔ اورنگ زیب نے جو فیصلہ سنایا تھا' اس کے آخری الفاظ یہ تھے۔ "مگر اس فیصلے کا اطلاق تجھ پر نہیں ہو گا اے دلیر خاتون! جو کچھ ہم نے پہلے کہا' لا علمی میں کہا۔ اگر ہمیں علم ہوتا کہ مردانہ بھیس میں ایک عورت ہے' یعنی تو' تو ہم کم از کم تیرے قتل کا حکم نہ دیتے۔ اب حقیقت ظاہر ہونے پر خود ہی وہ حکم منسوخ ہو گیا ہے کیونکہ وہ حکم ایک مرد کے لیے تھا' کسی عورت کے لیے نہیں! اور تو عورت ہے۔ تو اب تیرے لیے یہ ضروری نہیں کہ تو بھی عام جنگی قیدیوں کی طرح اپنی زندگی بچانے کے لیے تلوار اٹھائے۔ ہم اورنگ زیب عالمگیر تیرا

خون معاف کرتے ہیں۔" اسی کے ساتھ اس نے حکم دیا کہ بانو کو زنجیروں کی قید سے آزاد کر دیا جائے۔

اس تخصیص پر بانو خاموش نہ رہ سکی۔ قید سلاسل سے آزاد ہوتے ہی وہ آگے بڑھ کر احتراماً" اورنگ زیب کے سامنے جھکی۔ اورنگ زیب کے فیصلے نے اس کے دل پر بڑا اثر کیا تھا۔ اسے ہرگز کسی ایسے فیصلے کی توقع نہیں تھی۔ پہلے اس نے اورنگ زیب کے فیصلے پر اس کا شکریہ ادا کیا' پھر اپنی بابت بولی۔ " اے تاجدار مغلیہ! دشمن بہرحال دشمن ہوتا ہے۔ تمام قیدی برابر ہیں' ان میں عورت اور مرد کی کوئی تخصیص نہیں۔ اپنے ساتھیوں کی طرح میں نے بھی تجھ سے بھرپور جنگ کی ہے اور تیرے سپاہیوں کو موت کے گھاٹ اتارا ہے۔ اس لیے تیرے فیصلے کا اطلاق مجھ پر بھی ہونا چاہیے۔ مجھے یوں ہی آزاد کر کے شرمندہ نہ کر! میں تجھ سے التجا کرتی ہوں کہ مجھے باعزت ہونے کا موقع دے۔ یقین کر کہ میں تیری اس عطا کو کبھی فراموش نہیں کروں گی۔"

بانو کی بات سن کر اورنگ زیب کچھ دیر خاموش رہا' پھر اس نے نظر اٹھائی اور بولا۔ "ہمیں تیری خواہش کا پاس ہے اور ہم اسے منظور کرتے ہیں' مگر اس شرط پر کہ ہمارا کوئی مغل سپاہی ایک عورت سے مقابلے پر راضی ہو جائے۔ جہاں تک ہم سمجھتے ہیں کوئی باغیرت مغل اس پر آمادہ نہ ہو گا کہ ایک عورت پر تلوار اٹھائے۔ ہم اس بے غیرتی کے لیے کسی غیرت مند مغل کو مجبور نہیں کر سکتے۔ ہاں اگر کوئی تجھ سے مقابلہ کرنے کے لیے آمادہ ہو تو ہماری طرف سے پوری اجازت اور آزادی ہے۔"

اورنگ زیب نے انتہائی چالاکی سے کام لے کر مغل سپاہیوں کو بانو سے مقابلہ کرنے سے روک دیا تھا۔

پھر اورنگ زیب نے بہ آواز بلند اہل دربار سے کہا۔" کوئی اس دلیر خاتون کا مقابلہ کرنے پر راضی ہے؟"

جواب میں ہر طرف سے انکار ہی سنائی دیا۔ اورنگ زیب کو یہی توقع

بھی تھی۔ اورنگ زیب کی بات کہ تہہ تک پہنچنے میں بانو کو دیر نہ لگی۔ وہ اورنگ زیب کی دانش مندی کی قائل ہو گئی۔ اس نے انتہائی ذہانت کے ساتھ بانو سے بغیر کسی جبر کے وہی بات منوالی تھی جو وہ چاہتا تھا۔ پھر کوئی گنجائش ہی نہ رہی کہ بانو کچھ کہہ سکتی۔

دربار پر خاست ہونے سے پہلے اورنگ زیب نے یہ اعلان بھی کیا کہ جب تک بانو کے باپ عبدالرزاق کا کچھ پتا نہیں چل جاتا کہ وہ کہاں ہے اور کس حال میں ہے' بانو کی حیثیت اورنگ زیب کے مہمان کی ہو گی۔ یہی سبب تھا کہ جب کچھ دیر بعد قلعہ گولکنڈہ کے وسطی میدان میں اورنگ زیب' شہزادہ شاہ عالم اور دوسرے مغل سرداروں کی نشستوں کا بندوبست کیا گیا تو بانو کو بھی وہیں بٹھایا گیا۔ اس کی نشست شہزادہ شاہ عالم کے پہلو میں تھی۔ بانو کے جسم پر اب زنانہ لباس تھا اور اس لباس میں وہ ایک شہزادی معلوم ہو رہی تھی۔ یہ لباس اسے شاہی حرم سے فراہم کیا گیا تھا۔

سامنے ہی میدان میں زندگی اور موت کا خطرناک کھیل شروع ہونے والا تھا۔ اورنگ زیب نے بانو کو اپنے تمام مغل سرداروں پر فوقیت دی تھی۔ یہ بات بانو کے لیے کسی اعزاز سے کم نہ تھی۔ آج تک اورنگ زیب نے کسی عورت کو اتنی تکریم نہیں دی تھی۔ بانو کئی بار اچٹتی نگاہوں سے اپنے قریب بیٹھے ہوئے مغل شہزادے شاہ عالم کو دیکھ چکی تھی۔ یہ وہی شاہ عالم تھا جس سے پہلی بار مل کر بانو کے دل کی دھڑکنوں میں اضافہ ہو گیا تھا۔ بانو نے محسوس کر لیا تھا کہ شہزادہ شاہ عالم بھی کن آنکھیوں سے دیکھ رہا ہے۔ ایک بار تو ان دونوں کی نگاہیں بھی مل گئی تھیں اور بانو چور سی ہو گئی تھی۔ اس نے شاہ عالم کی طرف سے نگاہ ہٹا لی۔ بانو کو یہ علم بھی تھا کہ محض اس سے ملاقات کے سبب شہزادے کو قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑی تھیں۔ شاہ عالم کی طرف نظر ہٹا کر بانو میدان کی طرف دیکھنے لگی تھی جہاں قیدیوں کو لایا جا رہا تھا۔ اس لمحے بانو کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا اور وہ کچھ خجل سی ہو گئی تھی جب شاہ عالم

سے اس کی نظریں ٹکرا گئی تھیں جیسے کسی چور کو عین موقع پر چوری کرتے ہوئے پکڑ لیا گیا ہو۔ ادھر شاہ عالم بھی نگاہیں ملتے ہی اورنگ زیب کی طرف دیکھنے لگا تھا۔ اسے بھی اپنے عزت و وقرار اور منصب کا پورا خیال تھا اور یہ احساس بھی کہ وہاں اس کا باپ موجود ہے۔

قید ہونے والے قطب شاہی سپاہیوں کی تعداد تقریباً" تین سو تھی۔ بیک وقت سب کو میدان میں نہیں لایا گیا۔ انہیں تین گروہوں میں وہاں آنا تھا۔ اس وقت پہلا گروہ میدان میں لایا گیا تھا۔ میدان کو ہر طرف سے مسلح گھڑ سوار گھیرے میں لئے ہوئے تھے کہ کہیں کوئی قیدی فرار نہ ہو جائے! قیدیوں کو بادشاہ کے فیصلے سے آگاہ کیا جا چکا تھا۔ تقریباً" سو افراد پر مشتمل وہ پہلا گروہ مسلح کیا جا چکا تھا۔ انہیں باقاعدہ قطاروں میں کھڑا کیا گیا تھا۔

میدان میں لائے جانے سے پہلے قیدی سپاہیوں کو زنجیروں سے نجات مل گئی تھی، مگر ہتھیار میدان میں لائے جانے کے بعد ہی دیئے گئے تھے۔ ان سب کی زندگی کا دارومدار اس پر تھا کہ وہ اپنے مقابل آنے والے مغل سپاہیوں کو قتل کر دیں۔ قیدیوں کو ہتھیار تقسیم کر دیئے گئے تو مغل سپاہی میدان میں آ گئے۔ ان کی تعداد بھی قیدیوں کے برابر تھی۔ پھر اورنگ زیب کا اشارہ پاتے ہی مغل اور قیدی سپاہی ایک دوسرے پر بھوکے بھیڑیوں کی طرح ٹوٹ پڑے۔ ذرا ہی دیر میں لاشوں پر لاشے گرنے لگے جو بھی قیدی یا مغل سپاہی اپنے حریف کو قتل کرنے میں کامیاب ہو جاتا وہ ایک جانب جا کھڑا ہوتا تلواروں سے تلواریں ٹکراتی رہیں اور تن سروں سے جدا ہوتے رہے، سینے چھیدے جاتے رہے، لہو بہتا رہا وہ سبھی اپنی اپنی زندگی کی بقاء کے لیے لڑ رہے تھے۔ مارو یا مرجاؤ، اس کے سوا کوئی اور راہ نہیں تھی۔

جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، لڑنے والوں کی تعداد کم ہوتی گئی۔ جس میدان میں دو سو زندہ اور جیتے جاگتے انسان آئے تھے، وہاں کچھ ہی دیر بعد صرف سو افراد زندہ بچے۔ زندہ بچ جانے والوں میں سے بھی نصف کے قریب

اس قابل نہیں تھے کہ اپنے پیروں پر کھڑے ہو سکتے۔ وہ شدید زخمی تھے، مگر جب تک مقابلہ جاری رہا انہیں طبی امداد فراہم نہیں کی گئی۔ اس کے نتیجے میں اخراج خون کی زیادتی کے سب چھ افراد وہ جنگ جیت لینے کے باوجود زندگی کی جنگ ہار گئے۔

○-------○-------○

مقابلہ ختم ہوا تو میدان سے ایک سو چھ لاشیں اٹھائی گئیں۔ ان میں زیادہ تعداد قطب شاہی سپاہیوں کی تھی۔ شاید اس کی وجہ ان کی پست ہمتی تھی اور غالباً" یہ احساس بھی کہ ان کی سربراہ تماشائی بنی ہوئی تھی۔ انہوں نے بانو کو تخت شاہی کے قریب شہزادہ شاہ عالم کے ساتھ بیٹھے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ یہ بات ان کے لیے شدید صدمے کا سبب تھی کہ بانو ان کے خیال میں دشمن سے مل گئی تھی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ یوں آزادی کے ساتھ مغل شہزادے کے قریب نہ بیٹھی ہوتی۔ انہیں اس گفتگو کا علم نہیں تھا جو دربار میں بانو اورنگ زیب کے درمیان ہوئی تھی ورنہ وہ یوں حوصلہ نہ کھوتے' مگر بانو کو یہ باتیں بعد میں معلوم ہوئیں جب وقت گذر چکا تھا۔

جب میدان سے لاشیں اٹھائی جا چکیں تو قیدیوں کا دوسرا گروہ میدان میں لایا گیا۔ اس وقت بانو نے اورنگ زیب سے درخواست کی کہ مقابلے کے دوران جو مغل سپاہی یا قیدی فتح یحاب ہو جائے مگر شدید زخمی ہو تو مقابلہ ختم ہونے کا انتظار نہ کیا جائے' طبیب اور جراح فوراً" اس کی مرہم پٹی کریں۔

اورنگ زیب نے بانو کی یہ درخواست قبول کر لی۔ اس کے حکم پر میدان ہی میں طبیب و جراح طلب کر لئے گئے۔ اس طرح مقابلوں کا اختتام تک پانچ مغل سپاہی اور چار قیدی بچا لئے گئے۔ دوسرے مقابلے میں بھی وہی ہوا۔ قیدی زیادہ مارے گئے۔ یہ دیکھ کر بانو اداس ہو گئی' مگر وہ بے بس تھی۔ اس کا بس چلتا تو وہ اپنے ایک سپاہی کو بھی یوں بے بسی کی موت نہ مرنے دیتی۔ تیسرے مقابلے میں کسی قدر پلہ برابر رہا۔

آخر میں زندہ بچ جانے والے قیدیوں کو شمار کیا گیا تو ان کی تعداد صرف ایک سو بارہ تھی۔ ان میں سے بھی چالیس قیدی شدید زخمی تھے۔ زندہ بچ جانے والوں کی حیثیت اب بدل گئی تھی۔ اورنگ زیب کے حکم پر ان سے بہتر سلوک کیا جا رہا تھا۔ اورنگ زیب ہی کی اجازت سے بانو ان سے ملی اور زخمیوں کی عیادت کی۔ بانو نے ہر طرح ان کی دل جوئی کی اور انہیں تسلی دی کہ جیسے ہی وہ صحت یاب ہو جائیں گے' مغل فوج میں بھرتی کر لیے جائیں گے اور انہیں دربدر بھٹکنا نہیں پڑے گا۔ اپنے سپاہیوں سے ملاقات کے دوران ہی میں بانو کو ان کی کبیدہ خاطری کا علم ہوا۔ اس نے سپاہیوں کو حقیقت حال سے آگاہ کر دیا۔ زندہ بچ جانے والے سپاہیوں کے حوصلوں کی گرتی ہوئی دیوار سنبھل گئی۔ بانو کی حیرت بھی رفع ہو گئی کہ اس کے سپاہی کم ہمتی کا ثبوت کیوں دے رہے تھے۔

اسی روز شام کو بانو کے باپ عبدالرزاق کا سراغ مل گیا۔ قلعے پر قبضہ کرنے کے بعد بادشاہی گماشتوں نے ابوالحسن تاناشاہ کے مال و اسباب کو ضبط کر لیا تھا۔ اس دوران انہیں عبدلرزاق کے مغل فوج سے مقابلہ کرنے اور سخت زخمی ہونے کی اطلاعات بھی مل گئی تھیں۔ عبدالرزاق بھی بے ہوش ہی تھا کہ ایک مغل امیر روح اللہ خان کے پاس اسے اسی حالت میں پہنچا دیا گیا جیسے ہی ایک مغل امیر کہ جس کا خطاب صف شکن تھا' عبدالرزاق پر اس کی نظر پڑی تو وہ چیخ کر کہنے لگا۔ "یہ وہی بے ادب قطب شاہی سپہ سالار ہے جس نے اعلی

حضرت کا پیغام پرزے پرزے کر کے قلعے کے برج سے نیچے پھینک دیا تھا۔ اس کا سر کاٹ کر قلعے کے دروازے پر لٹکا دینا چاہیے اور اس کی لاش کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے قلعے کے اسی برج سے نیچے پھینک دینا چاہیے۔

اس موقع پر روح اللہ خان بولا۔

"اس مردے کے سر کو جس کی زندگی کا چراغ خود ہی گل ہونے والا ہے۔ بادشاہ کے حکم کے بغیر کاٹ دینا مروت اور بہادری نہیں۔"

نتیجۃً" امراء نے اورنگ زیب سے اس کا حال عرض کیا۔ اورنگ زیب پہلے ہی سے عبدالرزاق کی نمک حلالی' جرات اور بہادری کا معترف تھا۔ اس نے عبدالرزاق کے علاج کا حکم دیا۔ بادشاہی طبیوں میں ایک فرنگی طبیب اور ایک ہندو وئید کو اس کے علاج معالجے پر مقرر کیا گیا۔ اس موقع پر اورنگ زیب نے روح اللہ خاں سے کہا کہ اگر ابو الحسن کے پاس عبدالرزاق ایسا ایک اور سالار بھی ہوتا تو شاید قلعے کی تسخیر میں اتنا ہی عرصہ اور لگ جاتا۔

طبیبوں اور جراحوں نے عبدالرزاق کا معائنہ کر کے اطلاع دی کہ تقریباً" ستر زخم اسے لگے ہیں اور زخم پر زخم جو آئے ہیں' وہ اتنے ہیں کہ انہیں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی آنکھیں محفوظ رہ گئی تھیں مگر بینائی خطرے میں معلوم ہوتی تھی۔ بادشاہ نے اس کے علاج اور تیمارداری کے لیے سخت تاکید کی اور بہتر سے بہتر انتظام کا حکم دیا۔

بانو جو محل شاہی میں اپنے باپ کی طرف سے سخت فکر مند تھی' اسے یہ خبر ہوئی تو تڑپ اٹھی۔ اس نے خود اپنے باپ کی خدمت شروع کر دی۔ اورنگ زیب نے حکم دیا کہ جب تک بانو کا باپ مکمل طور پر صحت یاب نہیں ہو جائے گا' وہ شاہی حرم میں بیگمات کے ساتھ رہے گی۔

تیرہ دن شب و روز بہترین علاج اور تیمارداری کے نتیجے میں تیرہ دن کے بعد طبیوں نے بادشاہ کو اطلاع پہنچائی کہ اب عبدالرزاق نے آنکھ کھول دی ہے اور لکنت کیساتھ بات کرنے لگا ہے۔ اب اس کے صحت پا جانے کی

امید ہو گئی ہے۔

اورنگ زیب نے بانو کو بلوایا اور کہا۔ "ہماری طرف سے اپنے بہادر باپ کو پیغام پہنچا دو کہ ہم نے اس کے قصور معاف کر دیئے۔ اب ہم اس کے صحت یاب ہوتے ہی اسے منصب و عنایات سے نوازیں گے۔"

جب یہ عنایت آمیز پیغام بانو نے اپنے باپ کو دیا تو وہ رک رک کر بولا۔ "بادشاہ کی قدردانی کا شکریہ ادا کر دینا۔ یہ سخت جان ابھی تک جسم سے لگی ہوئی ہے' مگر اب زندگی کی کوئی امید بھی نہیں رہی ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کمال قدرت اور مہربانی سے مجھے دوبارہ زندگی بخش بھی دے تو اس بے دست و پا سے مغل بادشاہ کی نوکری نہ ہو سکے گی کیونکہ جس شخص کے جسم کا رواں رواں ابو الحسن کے نمک سے پرورش پایا ہے' وہ عالمگیر کی نوکری نہیں کر سکتا۔

بانو اس وقت یہ بات پی گئی کیونکہ عبدالرزاق سے یہ باتیں خلوت میں ہوئی تھیں اس لیے کسی اور کو علم نہ ہو سکا اور اس نے اورنگ زیب کی پیشکش کو ٹھکرا دیا ہے۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر بانو نے ابو الحسن تانا شاہ کی جان بخشی کرا لی۔ اورنگ زیب نے حکم دیا کہ ابو الحسن کو دولت آباد بھیج دیا جائے۔ اس کام کے لیے جاں سپار خان کو مقرر کیا گیا۔ ابو الحسن کی خاطر تواضع اور آرام و آسائش کے لیے اورنگ زیب نے تاکید کی کہ جو کچھ اسے پسند ہو مہیا کر دیا جائے۔ بانو کے لیے یہ حکم ہوا کہ جب تک عبدالرزاق مکمل طور پر صحت یاب نہ ہو جائے' وہ شاہی بیگمات ہی کے ساتھ رہے۔

اسی دوران میں شرزہ خاں بھی اپنی غداری کا انعام پا چکا تھا۔ اسے انعام و اکرام کے بعد مغل فوج میں شامل کر لیا گیا تھا' مگر بانو کو اس کا علم نہیں تھا۔

شاہی محل میں اب روز ہی بانو کی ملاقات شہزادہ شاہ عالم سے ہونے لگی تھی۔ اب وہ اپنے باپ کی طرف سے قدرے مطمئن ہو گئی تھی۔ اس نے سوچا تھا کہ مکمل صحت یابی کے بعد وہ اپنے باپ کو سمجھا بجھا کر اورنگ زیب کے

حق میں ہموار کرلے گی کہ وہ اورنگ زیب کی پیشکش قبول کرلے۔ اس وقت بانو کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ معاملہ ایک اور ہی نیا رخ اختیار کر جائے گا۔

شہزادہ شاہ عالم سے بانو کی ملاقاتوں کا بہانہ شطرنج کا کھیل تھا۔ شاہ عالم اچھی طرح شطرنج کھیلتا تھا اور بانو بھی اس کھیل میں ماہر تھی۔ انہیں ملاقاتوں کے دوران میں شاہ عالم نے بانو سے ایک ایسی بات کہہ دی جسے سن کر وہ بہت حیران ہوئی۔ اسے شاہ عالم سے ایسی گفتگو کی توقع نہیں تھی۔ اس وقت تخلیہ تھا۔

شاہ عالم بساط سے نظر ہٹا کر بانو کے حسین چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"کبھی کبھی ہمارا جی چاہتا کہ تم سے دانستہ ہار جائیں۔"

"جی!"

بانو اپنے پیادے کو آگے بڑھاتے ہوئے چونک کر حیرت سے کہنے لگی۔

"کیا شہزادے نے مجھ سے کچھ فرمایا۔"

شاہ عالم نے اپنی بات دہرائی اور مزید کہا۔

"یہاں تمہارے سوا اور کون ہے! ہم تمہی سے مخاطب ہیں' ہمیں جیت لو!"

بانو اس کی باتوں کے اصل مفہوم سے آگاہ ہونے کے باوجود بھی انجان بن کر بولی۔

"مگر بساط تو کچھ اور ہی کہہ رہی ہے۔ شہزادے کا پلہ بھاری ہے۔ میرے بادشاہ کو شہزادے نے نرغے میں لے رکھا ہے۔ کسی دم بھی شہ پڑ سکتی ہے۔"

شاہ عالم نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"اور ہم شہ نہ دیں تو؟" بانو مسکرائی اور بولی۔

"شہ دیئے بغیر شہزادے کا گھوڑا نہ بچ سکے گا۔ اس کے لیے گھر نہیں

ہے۔ میں نے پیادہ سی لیے آگے بڑھایا ہے۔

جواباً" شاہ عالم بھی مسکرایا۔ "گویا تم خود چاہتی ہو کہ ہم تمہیں شہ دینے پر مجبور ہو جائیں!"

"شہزادے کی مرضی ہے۔"

"مگر ہم تمہاری مرضی جاننا چاہتے ہیں۔"

بانو اب اچھی طرح سمجھ چکی تھیں کہ شہزادہ شاہ عالم کوئی اور ہی کھیل کھیل رہا ہے۔ گفتگو اس بازی کی بجائے کسی اور ہی بازی کی ہونے لگی تھی' اس لیے اس نے ٹالنے کی خاطر کہہ دیا۔

"حضور چال تو چلیں۔"

"چال تو ہم نے چل دی ہے۔ اب تو ہم تمہاری چال کے منتظر ہیں۔"

"کہاں شہزادے! مہرے تو اسی طرح رکھے ہیں۔"

"ارے واقعی!"

شاہ عالم ہنس پڑا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ بانو کھل کر بات کرنا نہیں چاہتی۔ وہ بولا۔

"اچھا تو پھر شہ بچو!" اس نے بساط کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

بازی ختم ہوئی تو بانو سے یہ بات چھپی نہ رہ سکی کہ شہزادہ جان بوجھ کر ہار گیا ہے۔ وہ چاہتا تو شہہ دینے کے بعد اپنے گھوڑے کو بہ آسانی بچا سکتا تھا' مگر اس نے ایسا نہیں کیا تھا۔ دوبارہ بساط پر مہرے جماتے ہوئے بانو نے شاہ عالم کو مخاطب کیا۔

"شہزادے نے اپنا گھوڑا کیوں نہیں بچایا؟" سوال کرتے ہوئے اس کی نظریں بساط پر تھیں' مگر وہ یہ محسوس کر چکی تھی کہ شاہ عالم کی نظر اسی پر ہے۔

"ہم نے تم سے کہا تو تھا کہ ہمیں جیت لو اور دیکھ لو کہ تم نے ہمیں

جیت لیا۔"

"مگر خود شہزادے نے یہ موقع مرحمت فرمایا تھا۔"

بانو نے صاف گوئی سے کام لیا۔

شاہ عالم اس کی بات نظرانداز کرتے ہوئے بولا۔

"خیر اس ذکر کو چھوڑو۔ ہم کئی دن سے ایک بات کہنا چاہتے ہیں' اگر کہو تو کہہ دیں!"

بانو کا دل تیزی سے دھڑک اٹھا۔ وہ کچھ اور ہی سمجھی تھی اس لیے سٹپٹا کر بولی۔ "جی ..... جی ..... فرمایئے۔"

شاہ عالم نے کہا۔ "جب تک تم یہاں ہو اپنی مردانہ وضع قطع ترک کرو' کیا یہ ممکن ہے ؟"

بانو نے اپنے سینے میں رکے ہوئے سانس کو آزاد کر دیا۔ شہزادہ شاہ عالم نے وہ بات نہیں کہی تھی جس کی اسے توقع تھی۔ پھر بھی وہ شاہ عالم کی اس خواہش کی وجہ پر غور کرتے ہوئے عجیب سے احساسات کا شکار ہو گئی۔ یہ احساسات اس کے لیے بالکل نئے تھے۔ وہ چپ رہی تو شاہ عالم نے اپنی بات دوبارہ کہی اور جواب چاہا۔ وہ بولی۔ "اگر یہ شہزادے کا حکم ہے تو پھر تعمیل ہو گی۔"

"حکم اور خواہش میں فرق ہوتا ہے۔"

بانو نے اس کی بات سن کر نظر اٹھائی۔ "شہزادے کی خواہش میرے لیے حکم کا درجہ رکھتی ہے۔"



اس دن کے بعد سے بانو نے مردانہ لباس پہننا ترک کر دیا۔ دوسرے ہی دن شاہی خیاطوں (درزیوں) نے اس کے حضور لباس فاخرہ پیش کر دیا۔ ہوش سنبھالنے سے اب تک بانو عموماً" مردانہ لباس ہی پہنتی آئی تھی۔ جب اس نے بہترین لباس زیب تن کیا تو خود بھی حیران رہ گئی۔ اس لباس میں اس کا رنگ روپ قیامت ڈھا رہا تھا۔ اسے اس لباس میں جس نے بھی دیکھا دیکھتا رہ گیا۔ قد بالا پر چینی ریشم کا کپڑا بہار دکھا رہا تھا۔ سیاہی مائل سرخ ریشم میں' ریشم ایسا ہی سرخ و سفید جسم' خمار آلود آنکھیں' دراز پلکیں' شانوں سے کمر کے نیچے تک زلفوں کی گھٹا اور اس پر خرام کہ جنبش شاخ طوبیٰ! بانو کو خود اپنا آپ اجنبی سا لگا۔ پہلی بار اسے اپنے قیامت خیز حسن کا احساس ہوا۔ یہ اس کی زندگی کا پہلا دن تھا اس کے دل میں نئے نئے اور عجیب جذبے جنم لے رہے تھے' ایسے جذبے جو کسی عورت کے دل ہی میں جنم لے رہے ہیں۔

اس روپ میں جب شہزادہ شاہ عالم نے اسے دیکھا تو جیسے ہوش کھو بیٹھا۔ عالم وارفتگی میں وہ دیر تک بانو کو دیکھتا رہا۔ بانو کی دراز پلکیں جھل

گئیں۔ وہ اظہار تشکر بھی نہ کر سکی۔ شاہ عالم کی وارفتگی کا مفہوم سمجھ لینا اس کے لیے مشکل نہ تھا۔ وہ بغیر کچھ کہے سنے جانے کے لیے مڑی تو شاہ عالم نے بڑھ اس کا دامن تھام لیا مگر زبان سے کچھ نہ کہا۔

بانو نے ملتجیانہ لہجے میں کہا۔

"شہزادے! دامن چھوڑ دیں کہ یہ دامن بے داغ ہے اور .... اور اسے بے داغ ہی رہنا چاہئے۔"

شاہ عالم ایسا ذہین شخص اس کے جملے کی گہرائی تک پہنچ گیا۔ اسے خود بھی اپنے اوپر اعتبار نہ تھا کہ وہ ہوش نہ کھو بیٹھے گا۔ اس نے بانو کا دامن چھوڑ دیا اور اس کی طرف سے منہ پھیر کر صرف اتنا کہا۔

"اب تم خلوت میں ہمارے قریب نہ آنا۔"

بانو چلی آئی۔ اس دن دوبارہ شاہ عالم کے سامنے جانے کی اسے ہمت نہ ہوئی۔ شاہ عالم نے بھی اسے طلب نہیں کیا۔ اسی دن وہ شاہ عالم کی بیگم نور النساء سے ملی۔ نور النساء نے اسے شک و شبے کی نظر سے دیکھا۔ یہ بات اس کے علم میں آ چکی تھی کہ ان دنوں شاہ عالم اپنا زیادہ تر وقت بانو کی صحبت میں ہی گزارتا ہے۔ شاہ عالم سے اس کی کئی اولادیں بھی تھیں۔ بانو اسے اپنے لیے خطرہ محسوس ہوئی تھی، لیکن اس خطرے کا اصل احساس اسے آج بانو کو زنانہ لباس میں دیکھ کر ہوا تھا۔ اس کے مخبروں نے بانو کے حسن کا جو نقشہ کھینچا تھا، وہ ہیچ ہو گیا تھا۔ بانو اس سے کہیں زیادہ حسین تھی۔ نور النساء بیگم کی سرد مہری کو بانو نے جلد ہی محسوس کر لیا اور محل کے اس حصے میں لوٹ آئی جہاں اس کا قیام تھا۔

دوسرے دن شہزادہ شاہ عالم نے شکار جانے کا قصد کیا اور بانو کو اس بہانے اپنے ساتھ چلنے کو کہا کہ وہ اس علاقے سے اچھی طرح واقف ہے اس لیے بہتر طور پر رہنمائی کے فرائض انجام دے سکے گی۔ شہزادے کی خواہش پر اس نے مردانہ لباس نہیں پہنا تھا۔ یہ بھی پہلا ہی موقع تھا کہ وہ مردانہ لباس

پہنے بغیر قلعے سے باہر نکلی تھی۔ شکار ہی کے دوران میں وہ اور شہزادہ شاہ عالم ایک ہرن کے تعاقب میں گھوڑے دوڑاتے ہوئے سپاہیوں سے کٹ گئے۔ اس ہرن کو بانو نے شکار کیا۔ تیر کھا کر ہرن کچھ دوڑا پھر گر گیا۔ وہ دونوں گھوڑے دوڑاتے ہوئے زخمی ہرن کے قریب پہنچ گئے۔ اس نے تیزی سے خنجر نکال کر ہرن کے گلے پر پھیر دیا۔ اس دوران میں شاہ عالم بھی اپنے گھوڑے سے اتر چکا تھا۔ کچھ دیر میں ہرن تڑپ کر ٹھنڈا ہو گیا۔

اس وقت شام قریب تھی اور جنگل پرندوں کی چہکار سے گونج رہا تھا۔ شاہ عالم جب شکار کیے ہوئے ہرن کو اپن گھوڑے کی پشت سے باندھ چکا تو بانو کی طرف مڑا جو اپنے گھوڑے کی رکاب میں پاؤں رکھ رہی تھی۔ شاہ عالم نے اسے اشارے سے روکا، پھر بولا۔ "اپنا گھوڑا کسی درخت سے باندھ دو۔"

بانو چونکی اور سنبھل کر بولی۔ "ہم اس وقت بھی خلوت میں ہیں اور حضور نے خلوت سے منع کیا ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے گھوڑے کی رکاب سے پاؤں نکال لیا۔

"اس وقت تاب نظارہ ہے۔" شاہ عالم مسکرایا۔ "ہم خلوت ہی میں تم سے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ اپنے گھوڑے کی لگام تھامے ایک قریبی درخت کی طرف بڑھ گیا۔

بانو نے بھی اسکی تقلید کی۔ کچھ دیر بعد ہی جب وہ دونوں ایک درخت کے نیچے جا بیٹھے تو بانو مسکرا کر بولی۔

"کیسا عجیب منظر ہے! کوئی دیکھے تو یقین نہ کرے۔ ایک باجبروت بادشاہ کا فرزند اور ولی عہد مغلیہ سلطنت یوں فرش زمین پر بیٹھا ہے۔"

"بادشاہ اور شہزادے بھی بہر حال آدمی ہوتے ہیں۔ ان کے سینوں میں بھی دل ہوتے ہیں اور انہیں دل کے تقاضے پورے کرنا ہی پڑتے ہیں۔"

"آپ کچھ مجھ سے ارشاد فرمانے والے تھے۔" بانو کے لہجے میں کسی قدر بے تکلفی کا عنصر تھا۔

شاہ عالم نے اس کی طرف وارفتہ نظروں سے دیکھا اور بولا۔ "ہمارے کل کے رویّے سے تمھیں کوئی بدگمانی تو نہیں ہوئی؟ ہم یہی دریافت کرنا چاہتے تھے۔"

"یہی یا اور کچھ اور بھی؟"

"ہم کچھ اور بھی کہیں گے، مگر پہلے ہمیں اپنے سوال کا جواب مطلوب ہے۔"

بانو چند لمحے خاموش رہی، پھر اس نے نظریں جھکا لیں اور کہا۔ "میرا خیال ہے کہ خود شہزادے کو اندازہ ہو گیا ہو گا۔ میں نے اسی وقت عرض حال کر دی تھی۔"

"ہاں ہمیں یاد ہے، ایک ایک لفظ جو اس وقت تم نے کہا تھا۔ خدا شاہد ہے ہمارا مقصد وہ نہ تھا بلکہ ..... بلکہ ہم تو ہمیشہ کے لیے تمہارا دامن تھام لینا چاہتے تھے اور چاہتے ہیں۔"

بالا آخر وہ لمحہ آ ہی گیا جب شہزادہ شاہ عالم نے اپنی خواہش کا برملا اظہار کر دیا۔ اب تک بانو مردوں پر احسان کرتی آئی تھی، مگر شاہ عالم ایک ایسے باپ کا بیٹا تھا جس نے اس پر احسان کیا تھا۔ اس کے نتیجے میں اور اسی احسان کے سبب وہ سانس لے رہی تھی۔ بانو کے منہ سے جانے کس طرح وہ چند الفاظ ادا ہو گئے جنہیں سن کر شاہ عالم جھوم اٹھا۔ اس نے کہا تھا۔

"شہزادے! یہ زندگی تو مجھے آپ ہی کے والد محترم نے بخشی ہے۔ اس کا مقدر اگر آپ کی خدمت ٹھہرے تو یہ میری خوش نصیبی ہے۔"

پھر دیر تک ان دونوں میں راز و نیاز ہوتے رہے۔ اس دوران بانو نے شاہ عالم کو بتا دیا کہ اس نے اب تک شادی سے کیوں گریز کیا۔ شاہ عالم نے اس یقین دلایا اور وعدہ کیا کہ نور النساء بیگم کی طرح اس پر کوئی پابندی عائد نہیں کی جائے گی۔ وہ بالکل آزاد ہو گی، جہاں اور جب چاہے آ جا سکے گی۔ اسے پردے میں بیٹھنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔ بانو کے دل میں جو خدشات تھے، شاہ عالم کے وعدوں سے دور ہو گئے۔ وہ جیسی آزادانہ زندگی بسر کرنا چاہتی تھی، شاہ عالم کے عقد میں آنے کے بعد بھی بسر کر سکتی تھی۔ اس پر بانو نے شکر گزاری کا اظہار کیا۔

"ہم تمہارے والد سپہ سالار عبدالرزاق کی مکمل صحت یابی کا انتظار کریں گے اور جب وہ صحت یاب ہو جائیں گے تو ان کے پاس نکاح کا پیغام بھیجیں گے۔ اگر یہ پیغام منظور کر لیا گیا تو اسے ہم اپنی خوش بختی تصور کریں گے۔"

شاہ عالم اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔

"میر شعار پریشان ہو گا اور سپاہی ہم دونوں کو تلاش کرتے پھر رہے ہوں گے۔ آؤ اب چلیں غالباً" ہم تمام معاملات طے کر چکے ہیں۔"

شاہ عالم نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ سپاہی سارے جنگل میں اسے اور بانو کو ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔ ان دونوں نے تھوڑا ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ ان کی تلاش میں سرگرداں سپاہیوں کا ایک دستہ مل گیا جو ساتھ ہو لیا۔

اسی شب شہزادہ شاہ عالم نے اورنگ زیب سے جشن فتح منانے کی درخواست کی۔ اورنگ زیب نے اجازت دے دی۔ بظاہر یہ جشن حالیہ فتح دکن کی خوشی میں تھا، لیکن حقیقت کچھ اور ہی تھی جس سے شاہ عالم اور بانو کے سوا کوئی آگاہ نہ تھا۔ اس جشن کے دوران پہلی بار شاہ عالم کو معلوم ہوا کہ بانو شعر گوئی کے علاوہ موسیقی میں بھی مہارت رکھتی ہے۔ اس نے جشن میں وہ سماں باندھا کہ مخلوق نے اس سے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ آج بانو بہت سرشار و مسرور تھی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ اس نے شاہ عالم کے عقد میں آنے پر رضا مند ہو کر اس کے باپ کا احسان اتار دیا تھا۔ اس کے ساتھ اس نے شاہ عالم سے وہ شرائط منوالی تھی جو آزادانہ زندگی بسر کرنے کے لیے ضروری تھیں۔ وہ جیسی زندگی گزارنا چاہتی تھی اسے میسر آ گئی تھی۔

تقریباً" ایک ماہ بعد عبدلرزاق اس حد تک صحت یاب ہو گیا کہ چلنے

پھرنے لگا۔ بانو، شاہ عالم کی دل دہی میں اتنی مصروف رہتی تھی کہ اسے باپ کو بادشاہ کے حق میں ہموار کرنے کا موقع نہ مل سکا تھا۔ اس کا نتیجہ بہت بھیانک نکلا۔ اورنگ زیب کو جب یہ معلوم ہوا کہ عبدالرزاق اب چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا ہے تو اس نے ایک قاصد اس کے پاس بھیجا اور کہلوایا کہ ہم نے جو وعدے کیے تھے، بھولے نہیں ہیں، خلعت، منصب اور انعام و اکرام لینے ہمارے حضور میں حاضر ہو جاؤ!

عبدالرزاق کو کیونکہ یہ علم نہیں تھا، بانو نے اورنگ زیب کو اس کے جواب سے مطلع نہیں کیا اس لیے لاعلمی میں وہ قاصد سے بولا۔ "میں تو پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ اس جسم میں ابوالحسن تاناشاہ کا اتنا نمک ہے کہ اب یہ کسی اور کی نمک حلالی کے قابل نہیں رہا۔ میں بادشاہ کے حضور حاضری سے معافی چاہتا ہوں۔ میری صرف ایک عرض ہے مجھے اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ حضور والا بیت اللہ جانے کی اجازت مرحمت فرما دیں تاکہ طواف حریم کی سعادت حاصل کرکے میں مغل بادشاہ کی درازئی عمر کے لیے دعا کروں۔"

قاصد نے لفظ بہ لفظ یہی پیغام اورنگ زیب کو جا کر دے دیا۔ اورنگ زیب نے اسے اپنی گستاخی پر محمول کیا اور اسے غصہ آ گیا۔ اس نے قہر آواز میں حکم دیا۔ "وہ جس حال میں بھی ہو اسے گرفتار کرکے ہمارے روبرو پیش کیا جائے اس طرح کہ وہ پابہ زنجیر ہو!"

سارے قلعے میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی کہ جس شخص کی بادشاہ نے اتنی ناز برداریاں کی تھیں، اس نے بادشاہ کے حضور میں حاضری سے انکار کر دیا تھا۔ اب اسی شخص کو بادشاہ کے سامنے پابہ زنجیر پیش کیا جانے والا ہے۔

بانو اس وقت بھی شاہ عالم کے پاس تھی۔ ان دونوں میں شطرنج کی بازی لگی ہوئی تھی۔ قلعے میں اک دم کھلبلی سی مچی تو شاہ عالم کو تشویش ہوئی۔ اس نے اپنے ایک خدمت گار کو طلب کرکے حقیقت حال دریافت کی۔ جواب میں خدمت گار نے جو کچھ بتایا اسے سن کر بانو کا چہرہ زرد پڑ گیا۔



اپنے بے قابو حواس پر قابو پانے میں بانو کو کچھ دیر لگی۔ اس نے جب شہزادہ شاہ عالم کی طرف نگاہ اٹھائی تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"اس قدر گھبرانے کی بات نہیں بانو!" شاہ عالم نے اسے تسلی دی۔ "خود ہم بھی چند روز قبل ہی عتاب شاہی کی گرفت سے آزاد ہوئے ہیں۔ تم جاؤ ہم کوئی سبیل کرتے ہیں۔ فکر نہ کرنا اللہ بہتر کرے گا۔"

بانو اٹھی تو جیسے اس کے پیروں میں جان نہیں تھی۔ وہ بہ مشکل محل کے اس حصے تک پہنچی جو اس کے لیے مخصوص تھا۔ اسے دنیا تاریک نظر آ رہی تھی۔ اس کے باپ عبدالرزاق کو اورنگ زیب نے پابہ زنجیر اپنے روبرو طلب کیا تھا اور یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ اورنگ زیب اپنے بیٹے شاہ عالم کو بھی حکم دے سکتا تھا کہ بانو کو وہ اپنے عقد میں نہ لے۔ شاہ عالم کو مجال نہیں تھی کہ وہ بادشاہ کے حکم سے سرتابی کر سکتا۔ بانو کو اب اپنی

بھیانک غلطی کا احساس ہو رہا تھا۔ اسے پہلے ہی اپنے باپ کو اورنگ زیب کے حق میں ہموار کر لینا چاہیے تھا' مگر اب وقت گذر چکا تھا۔

اہل دکن کی سفارش کر کے شاہ عالم ایک بار شاہی عتاب کا شکار ہو چکا تھا اس لیے اس نے بڑا محتاط قدم اٹھایا۔ اس نے براہ راست بانو کے باپ عبدالرزاق کی سفارش نہیں کی سے اورنگ زیب نے قید خانے میں ڈلوا دیا تھا۔ اورنگ زیب نے عبدالرزاق کو اپنے سامنے پابہ زنجیر بلوا کر اس سے کہہ دیا تھا کہ ہم بہت جلد ابو الحسن سے تمہاری نمک حلالی کا صلہ تمہیں دیں گے۔ اس کا واضح مطلب یہ تھا کہ اورنگ زیب محض اسے قید کرا کے مطمئن نہیں تھا بلکہ کوئی اور سخت سزا دینے کا ارداہ رکھتا تھا۔

شہزادہ شاہ عالم کا سوتیلا بھائی اعظم شاہ بھی ان دنوں اپنی سازشوں میں مصروف تھا۔ جب شاہ عالم کو بادشاہ نے قید کرا دیا تھا تو اسے یہ امید بندھ گئی تھی کہ اب اورنگ زیب اس کے ولی عہد ہونے کا اعلان کر دے گا مگر ایسا نہیں ہوا تھا۔ شاہ عالم کو رہا کر دیا گیا تھا۔ خود شاہ عالم بھی اچھی طرح واقف تھا کہ اعظم شاہ اس کی کاٹ میں لگا ہوا ہے اس لیے عبدالرزاق کی معافی اور رہائی کے سلسلے میں جلد بازی سے کام نہ لیا اور بانو کو تسلیاں دیتا رہا۔ کافی غور و خوض کے بعد بالا آخر اسے ایک راہ نظر آ ہی گئی۔

اورنگ زیب اپنے سپہ سالار فیروز جنگ سے بہت خوش تھا۔ شاہ عالم نے عبدالرزاق کی معافی اور رہائی کے لیے اس کو ذریعہ بنایا۔ فیروز جنگ زمانہ شناس شخص تھا۔ اسے معلوم تھا کہ ایک روز شاہ عالم ہی کو تخت نشین ہونا ہے۔ یہ موقع اچھا ہے کہ اسے ممنون احسان بنا لیا جائے' سو اس نے ہامی بھر لی۔ شاہ عالم نے اس سے راز داری کا عہد لے لیا تھا اور فیروز جنگ نے واقعی راز داری برتی۔

ایک روز جب اورنگ زیب خوش تھا تو اس نے عبدالرزاق کا ملہ سامنے رکھ دیا اور بولا۔

"وہ شخص نہایت بہادر ہے اگر وہ حضور کے دامن فیض سے وابستہ و گیا تو یقیناً وفادار ثابت ہو گا۔ حضور کا حکم ہو تو یہ خادم اسے راہ راست لا سکتا ہے۔"

"وہ احسان فراموش اور متکبر ہے۔"

اورنگ زیب نے کہا۔

"ہمارے احسان کو اس نے پس پشت ڈال دیا۔ بد قسمت اتنا ہے کہ ج بھی ایک معزول شخص ابو الحسن کی وفاداری کا دم بھرتا ہے۔ ہم نہیں ھتے کہ وہ سیدھی راہ پر آ جائے گا' لیکن اگر تم اس کے ضامن بن جاؤ تو اس معاملے پر غور کر سکتے ہیں۔"

فیروز جنگ نے عبدالرزاق کی ضمانت لے لی اور اورنگ زیب سے خواست کی کہ عبدالرزاق کو میرے حوالے کر دیا جائے۔ اورنگ زیب ے منظوری دے دی۔ یوں شاہ عالم اپنی محبوبہ بانو کے باپ کو بچانے میں میاب ہو گیا۔ پس پردہ رہ کر اس نے عبدالرزاق کو رہا کرا لیا تھا۔

عبدالرزاق کی رہائی کے کچھ روز بعد ہی یہ چرچا ہونے لگا کہ رنگ زیب' شہزادہ شاہ عالم کو اکبر آباد بھیجنا چاہتا ہے۔ خود اورنگ زیب ی مرہٹوں کی سرکوبی کے لیے دکن ہی میں رہنا چاہتا تھا۔ شاہ عالم فکر مند گیا۔ بانو اب محل سے نکل کر اپنے باپ عبدالرزاق کے ساتھ قلعے ہی کی ود میں ایک حویلی کے اندر رہتی تھی۔ شاہ عالم سے اب روزانہ ملاقاتوں کا لسلہ بھی بند ہو گیا تھا۔ خود شاہ عالم کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ الرزاق کی حویلی میں جاتا۔ ولی عہد سلطنت ہونے کی حیثیت سے یہ اس

کے لیے کسی طرح مناسب نہیں تھا۔ کبھی کبھار جب اس کا دل بانو کے لیے
بہت تڑپتا تو وہ باغ نگینہ میں اس سے خفیہ ملاقات کا بندوبست کر لیتا پھر بھی
وہ ڈرتا تھا کہ ان ملاقاتوں کا بھید کھل نہ جائے۔ اسے معلوم تھا کہ اورنگ
زیب کی مخبری کا نظام بہت پختہ ہے۔ پھر اس کے اندیشے رنگ لے ہی
آئے۔ وہی ہوا جس کا اسے ڈر تھا۔ ایک روز اورنگ زیب نے اسے خلوت
میں طلب کر ہی لیا۔

"کیا یہ درست ہے کہ تم عبدالرزاق کی بیٹی بانو سے خفیہ ملاقاتیں
کرتے ہو؟" اورنگ زیب نے استفسار کیا۔

شاہ عالم کا جھکا ہوا سر اورنگ زیب کی بات کا جواب تھا۔

"کیا تم نہیں جانتے کہ یہ تمہارے لیے کسر شان ہے! اگر تمہیں ا
لڑکی پسند تھی تو کیا تم عزت و شرافت کی راہ اختیار نہیں کر سکتے تھے! بولو
تم عبدالرزاق کے پاس یہ پیغام نہیں بھیج سکتے تھے کہ تم اس کی بیٹی کو ا
عقد میں لینا چاہتے ہو؟ جواب دو!" اورنگ زیب کی آواز بلند ہوتی گئی۔

شاہ عالم نے نظریں جھکا کر ہوا سر اورنگ زیب کی بات کا جواب
تھا۔

"کیا تم نہیں جانتے کہ یہ تمہارے لیے کسر شان ہے! اگر تمہیں ا
لڑکی پسند تھی تو کیا تم عزت و شرافت کی راہ اختیار نہیں کر سکتے تھے! بولو
تم عبدالرزاق کے پاس یہ پیغام نہیں بھیج سکتے تھے کہ تم اس کی بیٹی کو ا
عقد میں لینا چاہتے ہو؟ جواب دو!" اورنگ زیب کی آواز بلند ہوتی گئی۔

شاہ عالم نے نظریں جھکا کر اورنگ زیب سے معافی رنگ لی اور کہ
کہا کہ وہ آج ہی عبدالرزاق کے پاس عقد کا پیغام بھیج دے گا۔ جس بات
شاہ عالم اپنے لیے مصیبت سمجھ رہا تھا' وہی اس کے لیے رحمت بن گ

تھی۔

اسی روز شاہ عالم نے عبدالرزاق کے پاس پیغام بھیج دیا۔ عبدالرزاق نے بانو کا ایما دریافت کیا اور پھر اسے راضی بہ رضا پا کر پیغام قبول کر لیا۔ پھر عقد کی تاریخ بھی جلد ہی طے ہو گئی۔ اونگ زیب نے عقد سے پہلے عبدالرزاق کو طلب کر کے اسے چار ہزاری تین ہزار سوار کا منصب عطا کیا سے عبدالرزاق نے شکریئے کے ساتھ قبول کر لیا۔ اسی کے ساتھ حکم ہوا کہ بانو شاہ عالم کے عقد کے بعد عادل شاہی کوکن روانہ ہو جائے گا۔ عادل شاہی کوکن سمندر کے کنارے فرنگیوں کے تعلقہ گودا سے متصل تھا۔ عبدالرزاق کو وہاں کا صوبے دار بنا دیا گیا تھا۔ عبدالرزاق کیوں کہ اب اورنگ زیب کا سمدھی ہونے والا تھا اس لیے بخوشی اس نے اب مغل بادشا کی وفاداری کا عہد کر لیا تھا۔

عقد کی مقررہ تاریخ پر عبدالرزاق نے قلعے کے وسطی میدان میر نہایت عظیم الشان خیمہ نصب کرایا جس میں سینکڑوں افراد کی گنجائش تھی۔ ، خیمہ نسبتاً ایک بلند مقام پر بادشاہ، شہزادوں اور خاص خاص امرائے سلطنت کے لیے تھا۔اس کے علاوہ میدان میں اور بھی بڑے بڑے خیمے نصب تھے۔ اورنگ زیب نے پہلے ہی کہلوا دیا تھا کہ اس کے ساتھ کتنے آدمی آئیں گے۔

شرزہ خان کو جب یہ خبر ہوئی تھی کہ شہزادہ شاہ عالم نے بانو کا عقہ ہونے والا ہے تو اس کے سینے پر سانپ لوٹ گیا۔ ابھی تک اس کے دل سے کینہ نہیں نکلا تھا۔ اسے شاہ عالم اور اعظم شاہ کی رقابت کا بھی علم تھا۔ د اسی لیے کوشش کر کے اس مغل فوج میں چلا گیا تھا جو شہزادہ اعظم شاہ کی کمان میں تھی۔ شرزہ خان اپنی دانست میں شہزادہ شاہ عالم کو اپنا رقیب سمجھ تھا اسی لیے شاہ عالم کے مخالف گروہ میں چلا گیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ ایک

ایک روز دونوں بھائیوں میں ضرور ٹکراؤ ہو گا اور ٹکراؤ میں وہ اپنے رقیب شاہ عالم کی مخالف صفوں میں رہنا چاہتا تھا۔

عقد کی اس عظیم الشان تقریب میں شرزہ خان بھی شریک ہوا تھا۔ حالانکہ اس کا سینہ دھواں دے رہا تھا' پھر بھی وہ خوش نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔

جب اورنگ زیب عالمگیر' شاہ عالم اور دیگر امرائے سلطنت کے ساتھ قلعے کے میدان میں آیا تو عبدالرزاق کی طرف سے سپہ سالار فیروز جنگ نے آگے بڑھ کر اس کا استقبال کیا۔ وہ میزبانی کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ عبدالرزاق بھی فیروز جنگ کے ساتھ کھڑا تھا۔ اس نے بھی مہمانوں کو خوش آمدید کہا۔ اورنگ زیب' شہزادہ شاہ عالم' شہزادہ اعظم شاہ اور خاص خاص امراء کو مخصوص خیمے میں نہایت ہی مکلف اور بیش قیمت فرش پر بٹھایا گیا۔ کچھ ہی دیر بعد قاضی نے خطبہ پڑھا۔

عقد کے بعد سبھی نے اورنگ زیب اور عبدالرزاق کو مبارکباد دی اور پھر بانو رخصت ہو کر اپنے باپ کی حویلی سے شاہی محل میں پہنچ گئی۔

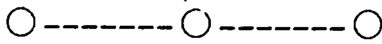
شاہ عالم سے بانو کے عقد کو ابھی ایک ماہ بھی نہ ہوا تھا کہ اورنگ زیب نے شہزادہ محمد معظم کو جس کا خطاب پہلے شاہ عالم تھا' بہادر شاہ کا لقب عطا فرمایا' پھر اسے اکبر آباد کے بندوبست اور وہاں کے مفسدوں کی سرکوبی کے لیے مستقل انتظام کے ساتھ با اختیار بنا کے رخصت کر دیا۔

اکبر آباد میں کچھ عرصہ گزرنے کے بعد اورنگ زیب نے ولی عہد شاہ عالم کو اس کے بیٹوں کے ساتھ صوبہ کابل کے بندوبست پر مامور کر دیا۔

بانو' شہزادہ عالم سے عقد کے بعد بہت خوش تھی۔ اسے جیسے اس کی منزل مل گئی تھی۔ اس نے اپنے حسن و جمال ہی سے شاہ عالم کے دل کو اپنی

طرف مائل نہیں کیا تھا بلکہ اپنی روشن دماغی' بیدار مغزی' پاکیزہ اخلاق و عادات اور شائستگی و تہذیب کی وجہ سے شہزادے کو اپنا مطیع کر لیا تھا۔ اس میں جو صفات تھیں' شاہ عالم کی پہلی بیوی نورالنساء بیگم میں نہیں تھیں۔ بانو کے لیے بڑا مسئلہ نورالنساء ہی تھی' مگر اس نے بہت کم عرصے میں نورالنساء کو بھی اپنا فریفتہ کر لیا۔ بانو کو اپنی سوکن کی ایک کمزوری کا علم ہو گیا تھا۔ نورالنساء کو زیورات و جواہرات بہت پسند تھے۔ بانو نے اس کی اسی کمزوری سے فائدہ اٹھایا اور اسے تحفے تحائف میں عمدہ زیورات اور جواہرات بھیجنے لگی۔ نورالنساء کے ساتھ اس کا سلوک سوکن کی بجائے بہن ایسا تھا۔ نتیجتاً نورالنساء بھی بانو سے عزت اور محبت کے ساتھ پیش آنے لگی۔

شاہ عالم اپنی بیوی اور محبوبہ بانو کی خداداد صلاحیتوں سے بخوبی واقف تھا اس لیے ملکی اور جنگی معاملات میں اس سے مشورہ کرتا تھا۔



بانو، ترکی، عربی اور فارسی زبان جانتی تھی، لیکن اشعار صرف ترکی اور عربی زبان ہی میں موزوں کرتی تھی، جو برجستگی اور الفاظ کی بندش، مطالب کی چستی اسے حاصل تھی، اس عہد کے دیگر شعراء میں کم دیکھی جاتی تھی۔ اس کے اشعار بیہودہ مبالغہ اراوی سے پاک و صاف ہوتے تھے۔ یا تو اس کے اشعار، اخلاقی مضامین کے رنگ میں ڈوبے ہوتے تھے یا بہادروں کی دلیرانہ کوششوں کی تعریف میں ہوتے تھے۔ وہ حسن و عشق کے بے نتائج جھگڑوں کو اپنی فطرت اور قومی طریق کے خلاف سمجھتی تھی۔ یہ بڑی عجیب بات ہے کہ باوجود شعر گوئی کا شوق ہونے کے اس نے اپنا زیادہ وقت اس میں صرف نہیں کیا۔ وہ جو قصیدہ یا غزل کہنا چاہتی، گھڑی دو گھڑی میں کہہ لیتی، یہ اس کی مشق سخن کا کمال تھا۔ اس کے ولولہ انگیز اشعار بہت جلد مغل سپاہیوں کی زبان پر چڑھ گئے۔

ولی عہد سلطنت شہزادہ شاہ عالم کی طرف سے افسروں اور عہدیداروں کے نام جس قدر احکام اور فرامین صادر ہوتے تھے، انہیں بانو ہی اپنے ہاتھ سے تحریر کرتی تھی۔ نیز شاہ عالم کے حضور میں جس قدر فرائض اور استغاثے یا یادداشتیں اور کارگزاریوں کی تفصیلات گزرتی تھیں، انہیں خود بانو ہی لکھتی تھی۔ اس کے کلام کی شیرینی، عبارت کی چستی، مطالب کا حسن اور الفاظ کی بندش بلا کی ہوتی تھی۔ اس کی ترکی اور عربی انشا پردازی، انشا پردازوں کے لیے قابل رشک تھی۔

شاہ عالم کی بیگم بن جانے کے بعد بانو بہت جلد اپنی تعجب خیز فاضی اور حیرت انگیز خوش اخلاقی میں مشہور ہو گئی۔ قابل تعریف بات یہ تھی کہ وہ اپنے فرائض اس جرات اور آزادی کے ساتھ ادا کرتی تھی کہ جس کے مثال ایشیائی سلطنتوں میں کم ہی مل سکتی ہے۔ امور مملکت کی تکمیل کے بعد جو وقت باقی رہتا، وہ یا تو انتظام خانہ داری اور شاہ عالم کی خدمت میں صرف ہوتا یا مختلف علوم کی کتب بینی میں۔

دکن میں قلعہ کنکیرا کی فتح کے بعد اورنگ زیب عالمگیر بیمار پڑ گیا۔ تمام اعضاء میں جوڑوں کا درد شدت کے ساتھ اٹھنے لگا۔ بادشاہ نے ضبط سے کام لے کر روزمرہ کے معمولات میں فرق نہ آنے دیا' نشست و اجلاس اور دربار منعقد کرنے حسب سابق خود کو مشغول رکھا تاکہ لوگوں میں کسی طرح کا انتشار پیدا نہ ہو' مگر کب تک! مرض بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ ایک دوبار بادشاہ پر غشی بھی طاری ہو گئی اور لوگوں میں طرح طرح کے چرچے شروع ہو گئے۔ دس بارہ دن تک سارے لشکر میں عجیب طرح کی ہلچل مچی رہی مگر جلد ہی اورنگ زیب روبہ صحت ہو گیا۔ لوگوں میں اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ حکیم صادق خان کی تجویز پر بادشاہ نے چینی کھانا شروع کر دی۔ تین چار ہفتے تک دوا پی اور ہر روز صدقہ دیا۔ جب دوا دارو کا سلسلہ ختم ہو گیا اور صحت ہو گئی تو حکیم کو بادشاہ نے اشرفیوں میں تلوا کر تمام اشرفیاں

اسے عطا کر دیں اور حکیم الملک کا خطاب دیا۔ پھر اورنگ زیب نے احمد نگر کی طرف کوچ کا حکم دے دیا۔

شہزادہ اعظم شاہ باپ کی بیماری کا حال سن کر احمد آباد سے احمد نگر پہنچ گیا۔ اورنگ زیب کو یہ بات پسند نہ آئی۔ اس نے اعظم شاہ کو اب صوبہ مالوا جانے کا حکم دیا وار چھوٹے شہزادے کام بخش کو صوبہ بیجاپور روانہ کر دیا۔ دوربین اورنگ زیب اپنی جسمانی کمزوری اور بیماری کو بخوبی محسوس کر رہا تھا۔ اسی کے ساتھ اعظم شاہ کے شور و شر کو بھی روز بروز بڑھتے دیکھ رہا تھا۔ دونوں شہزادے اعظم شاہ اور کام بخش بے قابو شیر کی طرح ایک دوسرے پر بپھرے جا رہے تھے۔ آنکھ بند ہوتے ہیں لشکر میں جو تباہی مچنے والی تھی' وہ اورنگ زیب کو صاف نظر آ رہی تھی۔ اس نے اسی لیے دونوں شہزادوں کو دو صوبوں پر مختار بنا کر الگ الگ ایک دوسرے سے دور بھیج دیا تھا۔ دونوں شہزادوں کو رخصت کر دینے کے بعد اورنگ زیب کی بیماری زور پکڑ گئی جو پہلے وقتی طور پر دب گئی تھی۔ اسے سخت بخار ہو گیا۔

تین چار دن تک تو اورنگ زیب نے فرض کی شدت کے باوجود حوصلہ نہ ہارا اور پانچوں وقت کی نماز با جماعت پڑھتا رہا۔ اسی اثنا میں حمید الدین خانک نے نجومیوں کی تجویز پر ایک ہاتھی اور ایک قیمتی الماس صدقہ دینے کی عرضداشات پیش کی۔ اورنگ زیب نے اس پر یہ تحریر کر کے دستخط کر دیئے کہ ہاتھی صدقہ میں دینا ہندوؤں اور ستارہ پرستوں کا طریقہ ہے۔ اس کی بجائے اورنگ زیب نے چار ہزار روپیہ قاضی القضات کے پاس بھجوایا کہ مستحقوں کو دے دیا جائے۔ اسی عرضداشت پر اونگ زیب نے یہ بھی لکھا۔

"اس خاکسار کو پہلی منزل پر پہنچنے کے بعد سپرد خاک کر دیا جائے'

زینت تابوت نہ بنایا جائے۔"

بیماری ہی کے دوران میں اورنگ زیب نے بیٹوں میں ملک کو تقسیم کے لیے ایک وصیت نامہ لکھ کر حمید الدین خان کے حوالے کر دیا تھا۔ نوے سال کی عمر ہو جانے اور شدید بیمار رہنے کے باجود اورنگ زیب عالمگیر کے ہوش و حواس میں فرق نہیں آیا تھا' صرف سماعت پر کچھ اثر تھا جس کا دوسروں کو پتا نہیں چلتا تھا۔

بالا آخر پچاس سال ڈھائی ماہ بادشاہت کرنے کے بعد نوے سال چند ماہ کی عمر میں جمعہ کے دن ۲۸ ذیقعدہ ۱۱۱۸ھ کو اورنگ زیب عالمگیر نے صبح کی نماز ادا کی اور کلمہ توحید کے ذکر میں مشغول ہو گیا۔ دن کا کچھ حصہ گزرا تھا کہ عالمگیر کی روح عالم بقا کی طرف پرواز کر گئی۔

دولت آباد کے قریب حضرت شیخ برہان الدینؒ اور دوسرے بزرگان دین کے درمیان مرحوم بادشاہ کو دفن کیا گیا۔ مزار کے خرچ کے لیے اورنگ آباد کے پرگنوں میں سے دولت آباد کی سرکار کے چند پرگنے علیحدہ کر کے انہیں پرگنہ خلد آباد کا نام دے دیا گیا۔

سب سے پہلے جو شہزادہ باپ کی موت کے بعد دکن پہنچا' وہ اعظم شاہ تھا۔ وہ مانوا کی صوبے داری سے رخصت حاصل کر کے بادشاہی لشکر سے بیس کوس پر پہنچ چکا تھا کہ شام کے وقت اسے بادشاہ کے انتقال کی خبر ملی۔ اس نے اپنا لاؤ لشکر تو وہیں چھوڑا اور جریدہ یلغار کرتا ہوا چھاؤنی کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہاں پہنچ کر وہ سیدھا گلال بار (بادشاہی احاطہ) میں داخل ہو گیا۔ اس وقت جتنے امیر وہاں جمع تھے' سب اس کے استقبال کے لیے بڑھے۔ اسد خان اور حمید الدین خان تعزیت و نگہبانی کے لیے سراپردۂ شاہی کے اندر تھے۔ امراء نے شہزادے سے تعزیت کی اور مبارکباد بھی دی۔

مرحوم بادشاہ کے کفن دفن کا بندوبست شہزادہ اعظم ہی کی نگرانی میں ہوا۔ اس سے فراغت پا کر شہزادہ اعظم نے ہندوستان اور ایران کے منجموں اور ستارہ شناسوں کی تجویز تک تخت نشینی کی تاریخ مقرر کر دی۔ ادھر شہزادہ کام بخش بیجاپورہ میں "دین پناہ" کے لقب سے تخت نشیں ہو گیا۔

شہزادہ شاہ عالم جو ان دنوں پشاور میں تھا' اسے اورنگ زیب کے انتقال کی خبر ملی تو اس نے اسی روز کوچ کا فیصلہ کر لیا۔

پشاور سے بانو کے ایماء پر شہزادہ شاہ عالم نے لاہور کا رخ کیا پھر لاہور کے نواح میں پہنچ کر شاہ عالم نے قیام کیا اور اسی منزل پر اپنے نام کا خطبہ پڑھنے اور سکہ جاری کرنے کا حکم دے دیا۔ اس وقت تک شہزادہ اعظم شاہ بھی اپنی بادشاہت کا اعلان کر چکا تھا۔ یوں ایک سلطنت میں اب تین بادشاہ حکومت کے دعویدار ہو گئے۔

لاہور سے شاہ عالم پہلے دہلی اور پھر اکبر آباد پہنچا اور شاہی خزانے پر قبضہ کر لیا۔ اعظم شاہ کو خبر ہوئی تو وہ شاہ عالم کا مقابلہ کرنے کے لیے اکبر آباد کی طرف چل دیا۔ اس کے ساتھ کوئی پچاس ہزار سوار تھے مگر خزانہ تقریباً" خالی تھا۔ اعظم شاہ نربدا عبور کر کے گوالیار پہنچ گیا تو اس کی اطلاع شاہ عالم کو ہوئی۔ شاہ عالم قتال و جدال سے ہمیشہ پہلو بچاتا تھا۔ اس کے برخلاف اعظم شاہ کی بہادری اور دلیری مسلم تھی۔

شاہ عالم نے اپنی عادت کے مطابق بانو سے اس سلسلے میں مشورہ کیا۔ بانو اپنے شوہر کے مزاج سے بخوبی آگاہ تھی۔ اس نے شاہ عالم کو مشورہ دیا کہ بہتر صورت یہ ہے' پہلے اعظم شاہ کو حضور مصالحت پر آمادہ کریں اور اسے پیغام بھیجیں' وہ صلح کر لے۔

پھر بانو نے پیغام کا مضمون لکھا اور شاہ عالم کو دکھایا۔ شاہ عالم نے

اس مضمون میں کچھ ترمیم و اضافہ کیا اور پھر اسے اعظم شاہ کے پاس روانہ کر دیا۔ شاہ عالم کو اس وقت تک مرحوم باپ کی وصیت کا بھی علم ہو چکا تھا۔

شاہ عالم نے اپنے بھائی اعظم شاہ کو جو پیغام مصالحت روانہ کیا' وہ یہ تھا۔

"ہمارے علم میں یہ آ چکا ہے کہ والد محترم نے اپنے خط خاص سے ملک کی تقسیم کے سلسلے میں وصیت نامہ لکھ دیا تھا۔ دکن کے پیچھے چھ صوبوں میں سے چار صوبے بشمول صوبہ احمد آباد تمہیں دے دیئے تھے۔ ان کے علاوہ میں تمہیں ایک دو صوبے اور بھی دے سکتا ہوں۔ میں نہایت درد مندی کے ساتھ تمہیں لکھ رہا ہوں کہ مسلمانوں کی خوں ریزی سے گریز کرو۔ خدانخواستہ اگر ہمارے اور تمہارے درمیان جنگ ہوئی تو پھر بہت خون بہے گا۔ اسلام پر ایمان رکھنے والوں کا اعتقاد یہی ہے کہ ایک مسلمان کے خون کے کفارے میں جو ناحق بہایا گیا ہو' اگر ایک ملک کا خراج بھی دے دیا جائے تو اس کی تلافی نہیں ہو سکتی۔ تمہیں چاہئے کہ والد بزرگوار کی وصیت کے مطابق اللہ نے جو کچھ عطا کر دیا ہے' اس پر راضی ہو جاؤ اور فتنہ و فساد کو رفع کرنے کی کوشش کرو۔ اگر تم بے انصافی اور زیادہ طلبی سے دست بردار نہیں ہونا چاہتے اور والد مرحوم کی وصیت پر رضی نہیں ہو' اپنی بہادری کا مظاہرہ کرنے پر تل گئے ہو تو پھر کیا ضروری ہے کہ اس فانی سلطنت پر ہمارے باہمی تنازع میں ایک مخلوق ماری جائے! بہتر یہ ہے کہ تنہا ہم اور تم مقررہ مقام پر ایک دوسرے سے مقابلہ کر لیں۔ پھر خود ہی فیصلہ ہو جائے گا کہ اللہ کی اعانت کس کے ساتھ ہے! چونکہ تم اپنی تلوار کے آگے کسی اور کے وجود کو تسلیم ہی نہیں کرتے اس لیے اس لڑائی میں تو تمہارا ہی فائدہ

ہے۔ ویسے اللہ تعالیٰ کی مدد جس کے ساتھ بھی ہو جائے۔"

جب یہ پیغام اعظم شاہ کو ملا تو اس نے بگڑ کر کہا۔

"اس کی عقل ٹھکانے نہیں رہی ہے۔ کیا اس نے گلستان نہیں پڑھی کہ دو بادشاہ ایک ملک میں سما سکتے اور دس درویش ایک کمبل میں سو جاتے ہیں۔ بھلا ایک نیام میں دو تلواریں کس طرح رہ سکتی ہیں!" پھر اعظم شاہ نے اپنی آستینیں چڑھا لیں اور ایک شعر پڑھا جس کا مطلب یہ تھا کہ جب کل آفتاب طلوع ہو گا تو میں ہوں گا، گرز ہو گا، میدان ہو گا اور افراسیاب ہو گا۔ یہ گویا شاہ عالم کے خلاف اعلان جنگ تھا۔

شاہ عالم ابھی اپنے خط کے جواب کا منتظر تھا کہ مخبروں نے اطلاع دی کہ اعظم شاہ کی فوج بڑی تیزی کے ساتھ آگے بڑھتی چلی آ رہی ہے۔ اس کا ارادہ یہ ہے کہ دریائے چنبل کو عبور کر کے اسے اپنے تصرف میں لے آئے۔ شاہ عالم کے لیے یہ خبر پرشیان کن تھی۔ وہ متذبذب ہو گیا کہ کرے تو کیا کرے؟ وہ سوچنے لگا کہ اگر میں اعظم شاہ کا حملہ نہیں روکتا اور اسے اسی کے حال پر چھوڑ دیتا ہوں کہ وہ جو چاہے کرے تو مجھے میرے اہل و عیال سمیت قتل کر دیا جائے گا۔ اسے علم تھا کہ اس کا سوتیلا بھائی اعظم شاہ نہایت بے رحم اور خوں ریز شخصیت کا مالک تھا۔ اسے مخلوق خدا کے خون نہ بہانے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ شاہ عالم کو فکر یہ تھی کہ اگر مقابلے کی صوت میں اسے شکست ہو گئی تو کیا ہو گا؟ اسی غور و فکر میں شاہ عالم، بانو کے پاس پہنچ گیا۔ بانو کو وہ خلوت میں لے گیا اور اس سے پوری صورتحال بیان کر دی اور پھر مشورہ طلب ہوا۔

"یہ کوئی ایسی فکر و پریشانی کی بات نہیں۔" بانو نے کمال پرسکون آواز میں کہا۔ اس کا اطمینان و سکون شاہ عالم کے لیے حیرت انگیز تھا۔ اتنی

بڑی اور تشویش ناک خبر سننے کے باوجود اس کے چہرے سے ذرا سی بھی فکر مندی کا اظہار نہیں ہو رہا تھا۔ یقیناً" وہ آہنی اعصاب رکھنے والی عورت تھی۔ ذرا توقف سے بانو نے پھر کہنا شروع کیا۔

"حضور، اعظم شاہ کو خط لکھ کر حجت تمام کر چکے ہیں۔ ایسی صورت میں بےگناہ مسلمانوں کا خون آپ کی گردن پر نہیں ہو گا۔ مسلمانوں کی خون ریزی ہونے میں کسی صورت آپ کا شرعی مواخذہ نہیں ہو سکتا۔ حضور کو فی الحال جنگی نقطہ نظر سے یہ کوشش کرنا چاہیے کہ دشمن دریائے چنبل عبور نہ کر سکے۔ یوں غنیم کی فوج دریا عبور کرنے کی تدابیر میں مصروف رہے گی۔ آپ اس عرصے میں جنگ کا انتظام و بندوبست بخوبی کر سکیں گے۔ اس طرح دشمن کو روک کر کچھ وقت مل گیا تو رسد کا بھی کافی طور پر سامان ہو جائے گا اور کسی بات کی زیادہ دقت نہیں اٹھانا پڑے گی۔"

شاہ عالم، بانو کی اس تدبیر سے خوش ہو گیا۔ محل سے نکل کر اس نے فوری طور پر خان زاد خان اور صف شکن خاں کو طلب کر لیا۔ ہ دونوں ہی توپ خانے کے بڑے بہادر داروغہ تھے۔ وہ دونوں شاہ عالم کے حضور میں آنے کے بعد آداب و تسلیمات بجا لائے۔ انہیں بھی اس وقت تک صورت حال کا علم ہو چکا تھا اس لیے وہ یک زبان ہو کر بولے کہ تعمیل حکم میں اپنی جان لڑا دیں گے۔

شاہ عالم نے خوش آئند تبسم کے بعد کہا۔

"تم دونوں اپنے ہمراہ چند فوجی بہادروں اور آغر خاں کو لے کر دریا کے پل پر قبضہ رکھو اور دشمن کو کسی طرح دریا عبور نہ کرنے دو۔"

اس نئی اطلاع کی روشنی میں شاہ عالم نے حکم دیا کہ فوج کا ایک بھاری دستہ سرائے جاجو کے ناکے پر نہایت ہوشیاری کے ساتھ کھڑا رہے۔

رستم خان کو حکم ہوا کہ اپنے ہمراہ توپ خانہ لے کر بہترین سواروں کے ساتھ گرداوری کرتا رہے اور دشمن کے لشکر کی نقل و حرکت کے متعلق متواتر خبریں پہنچاتا رہے۔ رستم خان' شاہ عالم کی فوج کا تجربہ کار اور نامور سالار تھا۔ اس کے بعد شاہ عالم نے اپنی فوج کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ایسا اس نے بانو کے ایماء پر کیا تھا جو اس جنگ میں شاہ عالم کے شانہ بشانہ داد شجاعت دینا چاہتی تھی۔ شاہ عالم نے اسے جنگ میں حصہ لینے سے روکنا چاہا مگر وہ نہیں مانی تھی۔ مجبوراً" شاہ عالم کو اس کی بات ماننا پڑی تھی۔ فوج کے ایک حصے کی کمان بانو کرنا چاہتی تھی' سو اس کے ایماء پر دوسرا حصہ شاہ عالم نے اپنے نوجوان شہزادے' محمد عظیم کی کمان میں مقرر کیا۔ محمد عظیم' شاہ عالم کی پہلی بیوی اور نورالنساء بیگم سے تھا۔ خان زماں کی نسبت شاہ عالم نے حکم صادر کیا کہ وہ فوج بندی میں مصروف رہے تاکہ جس وقت بانو یا محمد عظیم کو فوجی مدد کی ضرورت پڑے فوراً" مدد کی جائے۔ شہزادہ محمد عظیم کی بابت فرمان جاری ہوا کہ بانو کی رائے کے ذرا بھی خلاف کوئی قدم نہ اٹھائے۔ یوں تو فوج کے دو حصے تھے اور بانو صرف ایک حصے کی کمان کر رہی تھی' مگر عملاً" وہی تمام فوج کی سپہ سالار تھی۔

بانو تقریباً" پچاس ہزار فوج لے کر آہستہ آہستہ آگے بڑھی۔ اس وقت وہ مردانہ لباس میں تھی۔ یہ موقع اسے طویل عرصے کے بعد ملا تھا۔ بانو ایک چست و چالاک گھوڑے پر سوار تھی۔ اس کے پہلو میں تلوار لٹک رہی تھی۔ اس کا سارا جسم سر سے پاؤں لوہے میں غرق تھا۔ وہ زرہ بکتر پہنے ہوئے تھی۔ فولادی خود سر پر تھا اور ایک لمبا برچھا ہاتھ میں نظر آ رہا تھا۔ اس کے سینے کے قریب ایک زہر آلود خنجر لگا ہوا تھا' پشت پر ترکش لٹک رہا تھا اور کمان کاندھے پر جھول رہی تھی۔ اس کی پر قہر نظریں بار بار اس طرف

اٹھ رہی تھیں جدھر سے غنیم کے حملہ کرنے کی خبر تھی۔

بانو کے چہرے پر موجود تاثرات سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کسی گہری سوچ میں ہے' اور ایسا ہی تھا بھی! بانو کی کیفیت اس وقت بڑی عجیب تھی۔ وہ جنگ کی ہولناکی سے اچھی طرح آگاہ تھی۔ اس کی چشم تصور دیکھ رہی تھی کہ بہادروں اور جاں بازوں کے خون سے زمین سرخ ہو رہی ہے۔ ہزاروں بے تن سراسے خون کے دریا میں غوط زن دکھائی دے رہے تھے اور یہ بڑا دہشت ناک منظر تھا۔ وہ زخمیوں کی دل خراش صدائیں سن رہی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ متوقع فتح کی خوشی اس کے رگ و پے میں خون کی طرح دوڑ رہی تھی۔

ہونے والی جنگ کے نتیجے میں بانو لاعلم تھی مگر اس بات کا اسے کامل یقین تھا کہ اگر فتح ہو گئی تو وہ اپنے محبوب شاہ عالم کی نظر میں سرخرو ٹھہرے گی۔ اس کے باوجود بانو نے تصویر کے دوسرے رخ کو بھی نظرانداز نہیں کیا تھا۔ اس نے یہ بھی سوچا تھا کہ اگر خدانخواستہ جنگ میں شکست کا منہ دیکھنا پڑا تو وہ شاہ عالم کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گی۔

پھر وہ لمحات آہی گئے بانو نے جن کا تصور کیا تھا۔ دونوں فوجیں آمنے سامنے آ گئیں۔ اعظم شاہ نے اپنی فوج کی آراستگی بڑے انتظام کے ساتھ کی تھی۔ وہ پچاس ہزار خونخوار سواروں کو لے کر بڑی دلیری سے تلوار برہنہ کئے آگے بڑھ رہا تھا۔ ہر چند کہ فی الحال دونوں فوجوں کی تعادد یکساں تھی مگر شاہ عالم کے پاس تقریباً" تیس ہزار فوج محفوظ تھی جو کسی بھی لمحے مدد کو آ سکتی تھی۔ اعظم شاہ کا سامان جنگ اچھا نہ تھا مگر اس کے فوجی افسر بڑے تجربہ کار' سفاک اور قواعد جنگ سے بخوبی آگاہ تھے۔ خود اعظم شاہ بڑا بہادر شجاع شخص تھا۔ اس کی فوجی طاقت شاہ عالم سے یقیناً" کم تھی لیکن

جو بہادری اور دلیری اس جنگ میں اس نے دکھائی' اس سے اب تک تاریخ کی صفحات روشن ہیں۔

لشکر کے میمنے پر خود اعظم شاہ موجود تھا اور میسرے کو اس کا ایک بیٹا شہزادہ بیدار بخت سنبھالے ہوئے تھا۔ یہ جرار لشکر اس سمت کو چھوڑ کر جدھر بانو اور شہزادہ محمد عظیم بڑی مستعدی کے ساتھ حملہ روکنے کے لیے کھڑے انتظار کر رہے تھے' دوسرے سمت بڑھنا شروع ہو گیا۔ اعظم شاہ کا اشارہ پاتے ہی شہزادہ بیدار بخت ایک بڑے دستے کو ساتھ لے کر اچانک شاہ عالم کے لشکر پر ٹوٹ پڑا۔ یہ شاہ عالم کے لشکر کا پیش خیمہ تھا جس پر بیدار بخت نے حملہ کیا تھا رستم خان جو چند فوجی سالاروں کے ساتھ یہاں موجود تھا' ہر چند کہ اس نے بڑی دلیری اور جاں بازی کے ساتھ حملہ روکنے کی کوشش کی لیکن انجام کار اسے شکست ہوئی۔ تھوڑی دیر کی جنگ کے بعد میدان صاف ہو گیا۔ کچھ بہادر خون میں نہا نہا کر ٹھنڈے ہو گئے اور کچھ مقابلے کی تاب نہ لا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ بیدار بخت کے لشکر نے شاہ عالم کے پیش خیمے کو آگ لگا دی اور جو ساز و سامان تھا لوٹ لیا۔

بانو اور شہزادہ محمد عظیم کو جب پیش خیمہ تباہ ہونے کی خبر ملی تو دونوں اپنے اپنے لشکر لے کر تیزی سے اس طرف جھپٹے ہر طرف سے شاہ عالم کی فوجیں موج در موج اعظم شاہ کے ہراول کے مقابلے میں پہنچنے لگیں۔ اس وقت ذوالفقار خاں اور دوسرے مقرب سالاروں نے اعظم شاہ سے عرض کیا کہ خیر خواہانہ مشورہ یہ ہے' آج کی فتح پر شادیانے بجانے کا حکم ہو اور حضور اسی جگہ خیمہ لگا دیں مقابلے کو کل پر ملتوی کر دیں آج کی فتح' غلبے کی شہرت اور اس ہیبت سے کہ اصل مقابلہ کل ہوگا' دشمن کے لشکر میں بڑی افراتفری مچ جائے گی۔ دشمن کے لشکر سے بہت سے نامور سردار

ری فوج میں آ کر مل جائیں گے اور ایک بڑی تعداد بد حواس ہو کر بھاگ ڑی ہو گی۔

اس مشورہ پر اعظم شاہ برہم ہو گیا اور بولا

"یہ زنانہ پن ہے!" پھر اس نے مشورہ دینے والوں کو خوب کارا۔

۱۸ ربیع الاول ۱۱۱۹ھ کو جب کہ گرمی اور حدت سے زمین اور ان' لوہار کی بھٹی کے مانند دہک رہے تھے دونوں فوجوں کا مقابلہ اکبر آباد ، سات آٹھ کوس پر جاجو کے میدان میں ہوا۔

اعظم شاہ کی فوج ابھی لوٹ مار میں مصروف تھی کہ بانو اپنی جرار ج کے ساتھ اس پر ٹوٹ پڑی تیزی کے ساتھ دونوں طرف سے تلواریں ، لگیں' ذرا سی دیر میں بانو کی بہادر فوج نے مقابل کی فوج کے ایک بڑے دست دستے کو تہ تیغ کر ڈالا۔ بانو نسبتاً ایک اونچی جگہ کھڑی ہوئی اشاروں ، اپنے فوجی افسروں کو ہدایت دے رہی تھی کہ کدھر آگے بڑھنا ہے اور ھر سے پیچھے ہٹنا ہے!

جب اعظم شاہ کا ایک فوجی دستہ کٹ گیا تو وہ ایک اور دستے کو لے آگے بڑھا یہ دستہ پہلے سے زبردست تھا اور تلواریں اٹھائے آگے بڑھ تھا۔ اسی دستے میں شرزہ خان تھا۔ بانو نے اسے پہچان لیا۔ شرزہ خان کو کر بانو کا خون کھول اٹھا مگر اس نے خود پر جلد ہی قابو پا لیا۔ دراصل ، شرزہ خان کی وہ غداری یاد آ گئی تھی جس کی سزا بانو اسے آج تک نہ ، سکی تھی۔ دکن میں شرزہ خان عین حالت جنگ میں اسے دھوکا دے گیا اپنے جذبات پر قابو پا کر بانو نے جنگ کی حکمت عملی پر غور کیا۔ وہ بڑی باری سے اس دستے کو پیچھے لے گئی جو بڑی دیر سے لڑ رہا تھا اور دوسرا

تازہ دم دستہ مقابلے پر لے آئی اسی کے ساتھ اپنے گھوڑے کو ایڑلگائی اور دشمن کی صفوں کو چیرتی ہوئی اس طرف بڑھنے لگی جدھر اسے شرزہ خان نظر آیا تھا۔

طرفین سے تلواریں ایک دوسرے سے ٹکرا رہی تھیں اور تیرو کی بارش ہو رہی تھی ہزاروں سر کٹ کر گر رہے تھے اور جاجو کا میدا بہادروں کے خون سے دریا کی طرح لہریں لے رہا تھا۔ ہر طرف سے تیرو کی سائیں سائیں کی ہیبت ناک آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ زخمیوں کی دل دینے والی صدائیں ہر جانب سے بلند ہو رہی تھیں۔ توپوں کی ہولناک گو اور دھماکوں نے نقاروں اور قرنا کی آواز میں شامل ہو کر میدان جنگ وحشت سے لبریز کر دیا تھا۔ جنگجو دلاور دلیرانہ بڑھ کر ایک دوسرے پر حملے رہے تھے مست جنگی ہاتھی دو دو تین تین من وزنی لوہے کی زنجیروں لٹاوے جھومتے جھامتے بڑھ رہے تھے زنجیروں کی مار میں جو بھی آ جاتا گرتا کہ پھر نہ اٹھ پاتا۔ جدھر بھی یہ مست جنگی ہاتھی نکل جاتے قیامت جاتی۔

اس معرکہ کارزار میں بھی بانو بالآخر شرزہ خان تک پہنچنے کامیاب ہو ہی گئی۔ اس نے شرزہ خان کو للکارا جو کمان میں تیر جوڑ ر شرزہ خان بھی گھوڑے پر سوار تھا وہ بانو کو سنبھلنے کا موقع دیئے بغیر تیزی گھوڑا دوڑاتا سامنے آگیا۔

”شرزہ خان! آج فیصلے کا دن ہے“

بانو بہ آواز بلند شرزہ خان سے مخاطب ہوئی۔ ”آج تو میرے سے زندہ بچ کر نہ جا سکے گا۔ مجھے تجھ سے بہت پرانا حساب چکانا ہے اس کا حساب جب تو نے میرے ساتھ غداری کی تھی اور فریب دے کر نکا

کی فوج کے پاس تھے۔

میدان جنگ کا جائزہ لینے کے لیے بانو گھوڑے کی بجائے ایک ہاتھی پر سوار ہو گئی اور خون خوار جنگ کے ہولناک منظر کو پر قہر نظروں سے دیکھنے لگی۔ اس نے دیکھا کہ حملہ آور فوج شہزاد محمد عظیم کے لشکر کو برابر دباتی چلی آ رہی ہے۔ وہ مورچہ فتح کرنے کے بعد اب یہ فوج تیسرے مورچے کی طرف پیش قدمی کر رہی تھی۔

بانو اپنی کو فوج کو لے کر آگے بڑھی اور حملہ آوروں کی پشت پر پہنچ گئی۔ میدان جنگ کا جائزہ لینے کے بعد اس نے یہ نئی حکمت عملی استعمال کی تھی۔

شہزادہ بیدار بخت اپنی فتح کے جوش میں آگے بڑھا چلا آ رہا تھا کہ دفعتاً“ اسے ایک بھاری گرج سنائی دی عقب سے کوئی بڑی توپ داغی گئی تھی اسی کے ساتھ بھرپور حملہ کر دیا گیا تھا۔ بیدار بخت نے گھبرا کر ادھر کا رخ کیا اور مفتوحہ مورچے پر واپس آ کے ٹھہر گیا۔ اس کا وہاں ٹھہرنا ہی غضب ہو گیا۔ آناً“ فاناً“ بانو کی فوجیں دور دور تک پھیل کر ہلالی شکل میں صف آرا ہو گئیں اور تمام راستے روک لئے۔

بانو نے بیدار بخت کو گھیر لیا تھا ذرا توقف کے بعد اس نے گولہ باری کا حکم دیا تو حکم پر پے درپے گولے برسائے جانے لگے جنہوں نے بیدار بخت کی محصور فوج کا بالکل صفایا کر دیا ایک گولہ بیدار بخت کو بھی آ کر لگا اور اس کا جسم چیتھڑے ہو کر فضا میں بکھر گیا۔

اعظم شاہ کو اپنے جوان بیٹے کی موت کی خبر ملی تو اس کے دل پر گھونسا سا لگا۔ اس نے ایک دل دوز آہ بھری اور مست ہاتھی کی طرح پھنکارے مارتا شاہ عالم کی فوج میں ٹوٹ پڑا جدھر بھی وہ مردانہ وار نکل جاتا

صف کی صف الٹ جاتی' گھوڑوں کی پشت ننگی ہو جاتی اور ہاتھیوں کے ہودج خالی ہو جاتے جو موت کا مارا بھی اس کی زد میں آ جاتا زندہ نہ رہتا جس وقت اعظم شاہ مردانہ وار حملے کر رہا تھا' ابرہیم بیگ تبریزی گھوڑا دوڑاتا آیا وہ بڑا مشہور اور جنگجو سالار تھا۔ اس نے اعظم شاہ کو مخاطب کیا۔

"حضور! اب اپنے اس شیر کی جان نثاری بھی ملاحظہ فرمائیں" یہ کہہ کر وہ گھوڑے سے اترا اور شاہ عالم کی فوج میں گھس کر اس وقت تک لڑتا رہا جب تک جان نہ دے دی۔ اعظم شاہ کے دلیرانہ حملوں سے شاہ عالم کی فوج پسپا ہونے لگی۔

شاہ عالم کو میدان جنگ کی خبریں برابر مل رہی تھیں۔ جب اسے یہ خبر ملی کہ اعظم شاہ کے جاں نثاروں نے تباہی مچا دی ہے تو وہ تیس ہزار محفوظ تازہ دم فوج لے کر میدان جنگ میں پہنچ گیا شاہ عالم کی رکاب کے امیروں میں خان زمان کے علاوہ بڑے بڑے دلاور امیر تھے۔

گردو غبار اور بارورد کے دھویں سے فضا تاریک ہو رہی تھی اور کسی کو کسی کی خبر نہیں تھی۔ اسی دوران ان پر بیدار بخت کا چھوٹا بھائی شہزادہ والا جاہ بھی بندوق کی ایک گولی لگنے سے مارا گیا۔ شاہ عالم کے میدان جنگ میں پہنچنے کے بعد گویا قدرت نے اس کی مدد کی' قبلے کی سمت آندھی اٹھی اس آندھی کا رخ اعظم شاہ کی فوج کی طرف تھا۔ اودھر شاہ عالم کے لشکر کی پشت تھی جو تیر بھی شاہ عالم کی طرف سے چھوڑا جاتا آندھی کی وجہ سے اس کی قوت اور رفتار اتنی تیز ہو جاتی کہ زرہ بکتر کو توڑتا ہوا نکل جاتا۔ پھر ریت کے ذرے تھے جو اعظم شاہ کے سپاہیوں کے چہرے پر چھروں کی طرح جا کر لگ رہے تھے یہ طوفان اس وقت عاد و ثمود کا طوفان بنا ہوا تھا۔ اعظم شاہ کے لشکر سے مسلسل گولے چھوڑے جا رہے تھے مگر وہ ہوا کے مخالف

دباؤ کی وجہ سے درمیان ہی میں رہ جاتے تھے شاہ عالم کی فوج تک نہیں پہنچ پاتے تھے۔

میدان جنگ میں شاہ عالم کی آمد کے ساتھ ہی بانو بھی اس سے آ ملی تھی۔ اس موقع پر بانو نے شاہ عالم کو مشورہ دیا کہ اعظم شاہ کو آگے بڑھنے دیا جائے اس نئی جنگی حکمت عملی اور دانستہ پسپائی کو اعظم شاہ اور اس کے سالاروں نے اپنی فتح کا پیش خیمہ جانا۔ وہ سمجھے کہ ان کا دشمن میدان چھوڑ کر بھاگ رہا ہے۔ اعظم شاہ کو اس وقت ہوش آیا جب اسے اور اس کی فوج کو ہالے کے مانند چاروں طرف سے گھیر لیا گیا۔

اعظم شاہ کے امیر ذوالفقار خان نے جب یہ دیکھا کہ میدان ہاتھ سے نکل گیا ہے اور بہادر ہمراہیوں کی ایک بڑی تعداد ختم ہو چکی ہے اور اعظم شاہ پر ایسا تنگ وقت آ گیا ہے کہ اس کے بچنے کی امدی نہیں رہی تو اس کے ذہن میں ایک تدبیر آئی۔ وہ اعظم شاہ کے پاس پہنچا اور کہا۔

"یہ ماجرا آپ کے آبا و اجداد پر بھی گزر چکا ہے۔ ایسے وقت پر وہ تنہا لشکر سے نکل گئے اور وقت کے تقاضے کو ملحوظ رکھا۔ اس وقت بہتر یہی ہے کہ آپ میدان جنگ سے نکل کر کسی محفوظ جگہ چلے چلیں پھر قسمت ساتھ دے گی تو وہاں سے اس کی تلافی و تدارک کا بندوبست کر لیا جائے گا۔"

یہ سن کر اعظم شاہ بگڑ گیا اور جواباً بولا۔

"بہادر جی! تم اپنی جان بچا کر جہاں جانا چاہو چلے جاؤ' ہمارے قدم اس جگہ سے نہیں ہٹیں گے! بادشاہوں کے لیے یا تو تخت ہوتا ہے یا تختہ ان کے درمیان کچھ اور نہیں!"

کچھ دیر بعد ذوالفقار خان گوالیار کی طرف فرار ہو گیا اور حمید الدین

خان بھی اس کے ساتھ نکل گیا۔

اعظم شاہ کے اطراف اب زیادہ فوج نہیں رہی تھی' مگر وہ ابھی حوصلہ نہیں ہارتا تھا۔ اس نے تخت یا تختہ کے مصداق آخری بارہ شاہ عالم کی فوج پر ہلہ بول دیا اس کا یہ حملہ انتہائی شدید تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ اس حملے میں شاہ عالم کی فوج کو اپنے مقابل سے بھگا دے گا۔ آندھی کا زور اب قدرے تھم گیا تھا۔

○ ------- ○ ------- ○

ابھی آندھی کا زور ٹوٹے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ ایک بار پھر اس میں شدت پیدا ہو گئی۔ یہ دیکھ کر اعظم شاہ نے چیخ کر کہا۔

"شاہ عالم مجھ سے جنگ نہیں کر رہا بلکہ میرا خدا اور میرا نصیبہ مجھ سے برگشتہ ہو گیا ہے۔

اپنے ہاتھی کی عماری میں اعظم شاہ نے کم عمر شہزادے عالی تیار کو بٹھا رکھا تھا اور اسے تیروں اور گولوں سے بچا رہا تھا۔ اعظم شاہ کے ہاتھی کے دو تین فیل بان گولہ باری میں کام آ چکے تھے۔ اس کا ہاتھی بھی بری طرح زخمی ہو چکا تھا اور بے چین ہو رہا تھا۔ اعظم شاہ کو بھی سخت زخم آئے تھے' مگر غیرت و شجاعت کا یہ عالم تھی کہ وہ اب بھی شکست قبول کرنے پر تیار نہیں تھا۔ زخموں سے چور اس کے ہاتھی میں اب اپنی جگہ سے آگے بڑھنے کی طاقت نہیں رہی تھی۔ اعظم شاہ نے پھر بھی ہمت نہ ہاری۔ اس نے ہاتھی

کو بٹھا کر اترنے اور گھوڑے پر سوار ہو کر ایک دفعہ پھر قسمت آزمائی کا فیصلہ کیا۔ اسی خیال سے وہ عماری سے باہر نکلا۔ بانو کی نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ اس نے کمان میں تیر جوڑا اور اعظم شاہ کی پیشانی کا نشانہ لیا۔ وہ تیر اتنی قوت سے پھینکا گیا تھا کہ اعظم شاہ کی پیشانی میں گھستا چلا گیا۔ تیر کاسہ سر توڑ کر اعظم شاہ کے دماغ میں اتر گیا تھا۔ تیر کھا کر اعظم شاہ کو اٹھنا نصیب نہیں ہوا اور اس کی روح سفر آخرت پر روانہ ہو گئی۔ شاہ عالم کے لشکر میں فتح کا نعرہ بلند ہو اور شادیانے بجنے لگے۔

رستم علی خان، اعظم شاہ کے ہاتھی کے قریب پہنچ چکا تھا۔ وہ ہاتھی پر چڑھ گیا اور اعظم شاہ کا سر کاٹ کر اپنے دامن میں چھپا لیا اور شاہ عالم کے حضور میں پیش کرنے کے لیے روانہ ہو گیا۔ اسے امید تھی کہ اس کارگزاری پر انعام و اکرام سے نواز جائے گا۔ اعظم شاہ کے سر کو لے کر رستم علی خان، شاہ عالم کے سامنے حاضر ہوا اور شاہ عالم کی مزید خوشنودی کی خاطر دامن کے نیچے سے سر نکال کر پہلے اس نے دانتوں سے خون آلود رخساروں کا کاٹا، پھر سر کو شاہ عالم کے ہاتھی کے پیروں میں ڈال دیا۔ اس کے بعد آداب و تسلیمات بجا لایا۔

انعام و اکرام سے نوازنے کی بجائے شاہ عالم نے غضب ناک ہو کر اسے قہر آلود نظروں سے دیکھا۔ رستم علی خان سہم کر پیچھے ہٹ گیا۔ شاہ عالم کی انکھوں میں انسو آ گئے۔ پھر یہی آنسو اس وقت بھی بہے جب مغلیہ تخت و تاج کا دوسرا دعویدار شہزادہ کام بخش زخمی حالت میں، شاہ عالم کے بازوؤں میں دم توڑ رہا تھا۔ یہ واقعہ شاہ عالم کی تخت نشینی کے دوسرے سال کا ہے۔ شاہ عالم نے اپنے چھوٹے بھائی شہزادہ کام بخش کو پیغام بھیج کر سمجھانے بجھانے کی بہت کوشش کی تھی مگر وہ مقابلے سے باز نہیں آیا تھا اور اخر کار اپنے

انجام کو پہنچا تھا۔

شاہ عالم دکن سے لوٹ رہا تھا کہ راستے میں اسے خبر ملی کہ مرہٹوں سے ساز باز کر کے شرزہ خاں نے بھونگیر کے قلعے پر قبضہ کر لیا ہے۔ یہ قلعہ شہر حیدر آباد سے سولہ کوس پر تھا۔

"پیٹھ پھیرتے ہی دکن والوں نے رنگ دکھانا شروع کر دیا!

شاہ عالم قدرے غصے سے بولا۔

وہ ایک گداز دل شخص تھا اس لیے کم ہی غصہ آتا تھا مگر اس موقع پر وہ اپنا غصہ ضبط کر سکا۔ اس نے مزید کہا۔

"ہم بہ نفس نفیس اس غدار کی سرکوبی کے لیے جائیں گے۔ جلد از جلد واپسی کے لیے کوچ کی تیاریاں کی جائیں۔"

اس نے حکم دیا۔

"ہم خود وہاں جا کر ملاحظہ کریں گے کہ دکن والوں میں اب بھی کتنا دم خم باقی رہ گیا ہے!"

بھونگیر کا قلعہ دار ایک شخص احمد حسن تھا جو شرزہ خاں سے مل گیا تھا۔

جب یہ واقعہ بانو کے علم میں آیا تو وہ سخت مضطرب ہو گئی۔ شرزہ خان کے بارے میں سبھی کو علم تھا کہ قطب شاہی کمانڈروں میں سے ایک تھا اور خود بانو بھی قطب شاہی فوج میں رہ چکی تھی۔ اس طرح یہ معاملہ ایک اور ہی رخ اختیار کر گیا تھا۔ افترا پردازوں نے یہ افواہیں پھیلانا شروع کر دی تھیں کہ درپردہ شرزہ خاں کی بغاوت میں بانو کا ہاتھ ہے۔ دکن میں وہ ایک بار پھر قطب شاہی حکومت قائم کرنا چاہتی ہے اور اسے مغلوں کے تسلط سے نکالنے کے درپے ہے۔ یہ افواہیں دراصل خود شرزہ خاں کے ایماء اور

اشارے پر پھیلائی گئی تھیں۔ ان افواہوں سے اس کا مقصد یہ تھا بانو' شاہ عالم کی نظر سے گر جائے۔ بانو اپنے دشمن کا مقصد سمجھ چکی تھی۔

شرزہ خاں کی سازش کو ناکام بنانے کے لیے بانو نے شاہ عالم کے بات کی۔ اس نے شاہ عالم سے کہا۔

"بادشاہ کی یہ کنیز عرض کرنا چاہتی ہے کہ یہ بادشاہ کے شایان شان نہیں کہ خود اس غدار کی سرکوبی کے لیے تشریف لے جائیں۔ اس کم اصل کا سر قلم کرنے کے لیے بادشاہ کو زحمت نہیں کرنا چاہیے۔ اس نافرمان کا سر بادشاہ کے قدموں میں لا ڈالنے کے لیے یہ کنیز ہی کافی ہے۔"

شاہ عالم چونک اٹھا اور بولا۔

"کیا تم بھونگیر جانا چاہتی ہو! ہم بھلا تمہیں اس کی اجازت کس طرح دے سکتے ہیں!"

"کنیز کو اس سرکش شرزہ خان سے کچھ پچھلے حساب بھی چکانا ہیں اس لیے التماس ہے کہ بادشاہ حضور' کنیز کو اجازت مرحمت فرما دیں۔"

اول اول شاہ عالم انکار کرتا رہا مگر بانو کے اصرار پر اسے راضی ہونا ہی پڑا۔

بارہ ہزار مغل سپاہیوں کی سرکردگی میں شاہ عالم نے بانو کو قلعہ بھونگیر روانہ کیا۔ بانو مردانہ لباس میں جسم پر ہتھیار سجا کے گھوڑے کی پشت پر بیٹھی تھی۔ خود شاہ عالم اس گھوڑے کی باگ تھامے ہوئے تھا اور یہ بہت بڑا اعزاز تھا۔

مغل سپاہیوں کو ساتھ لے کر بانو قلعہ بھونگیر کی طرف روانہ ہو گئی۔ راستے میں اس نے بہت کم آرام کیا۔ وہ بس اچانک ہی دشمن پر ٹوٹ پڑنا چاہتی تھی۔ احمد حسن او شرزہ خاں کو گمان بھی نہ تھا کہ اس قدر جلد

نی مسافت طے کر کے مغل فوج بھونگیر پہنچ سکتی ہے۔ اس غفلت سے بانو نے پورا فائدہ اٹھایا اور قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ محاصرے کے بعد بانو نے ایک ط اپنے قلم سے لکھ کر احمد حسن کو روانہ کیا۔ خط کا مضمون یہ تھا۔

"احمد حسن کو معلوم ہو کہ تم نے جو بغاوت و سرکشی کی آگ بھڑکائی ہے' اچھا نہیں کیا۔ میں مغل تاجدار شاہ عالم کی بیگم امتہ الحبیب بانو تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ اگر تم اب بھی سرکشی و خود سری سے باز آ گئے تو مغل بادشاہ کے نزدیک تمہاری ویسی ہی توقیر تسلیم کی جائے گی جیسی اس سے پہلے تسلیم کی جاتی تھی۔ اگر تم نے بعض فتنہ پرور اشخاص کے اشتعال دلانے سے اس آگ کو بھڑکانے کی کوشش کی تو پھر خوب سمجھ لینا کہ بغاوت و سرکشی کا انجام کیا ہوتا ہے! تمہارے ساتھیوں کی مغرورانہ گردنیں توڑ کر زمین پر ڈال دی جائیں گی اور تمہارا تن بے سر' بہادروں کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے پاش پاش اور چور چور کر دیا جائے گا۔ میں نے مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ جب تک جسم میں روح باقی ہے' لڑائی سے منہ نہ موڑوں گی اور جب تک تمہاری لاش گھوڑوں کے سموں میں نہ دیکھ لوں گی صلح پر آمادہ نہیں ہوں گی۔ میں مخلوق خدا کی خوں ریزی سے اپنی

آب دار تلوار کو رنگین کرنا ناپسند جانتی ہوں۔
یہی وجہ ہے کہ بہ اصرار تم سے کہتی ہوں کہ
اپنی اس غلط کوشی اور سر کشی کو چھوڑ دو۔ یہی
تمہارے حق میں بہتر ہے۔ باقی والسلام۔"

اس خط کا جواب بانو کو فوراً ہی مل گیا۔ خلاف توقع احمد حسن نے بہت لجاجت آمیز جواب دیا۔ اس کے خط کا مضمون یہ تھا۔

"آپ کے غلام کا سر حاضر ہے' چاہے اسے اپنی تلوار سے کاٹ کر فراک میں باندھیے' چاہے اپنے قدموں میں جھکانے کی عزت عطا کیجیے۔ خدا گواہ ہے کہ نہ میں باغی ہوں' نہ میں بغاوت کی آگ بھڑکانے کی کوشش کی ہے۔ ہاں بعض ایسے حالات درپیش ہیں جنہوں نے مرے بارے میں بغاوت کا گمان پیدا کر دیا ہے۔ بالفرض مجھ گردن زدنی سے کوئی اس قسم کی بات وقوع میں بھی آئی ہو تو میں اس کی معافی کا خواستگار ہوں۔ غلام سے یہ بھی نہ ہو سکے گا کہ آپ کی حکم عدولی کرے یا فرمان حضور سے سرمو تجاوز کر جائے۔ کل صبح حضور کے لیے قلعے کا دروازہ کھول دیا جائے گا اور غلام بھی دست بستہ حاضر ہو گا۔ بادشاہ اور حضور کی خاک پا..... گناہ کار احمد حسن۔"

بانو یہ جواب پا کر اپنی خوش نصیبی پر بہت مسرور ہوئی۔ اس نے سوچا کہ اس فتح یابی کے بعد شاہ عالم کی نظروں میں میری عظمت اور بھی بڑھ جائے گی' مگر وہ یہ بھول گئی کہ احمد حسن کے ساتھیوں میں شرزہ خاں بھی ہے۔ بانو کی جگہ اگر کوئی جہاں دیدہ اور تجربہ کار مرد بھی ہوتا تو اس اطاعت آمیز خط سے دھوکا کھا جاتا۔ یہ خط درحقیقت شرزہ خاں کی مرضی و منشاہی سے لکھا گیا تھا۔ شرزہ خاں کو جب علم ہوا کہ خود بانو دام میں آ پھنسی ہے تو اس کے سارے پرانے زخم ہرے ہو گئے۔ بانو کا ایک فقرہ اب بھی اکثر اس

ساعت میں گونجتا تھا کہ شیرنی' شیر کے لیے پیدا ہوتی ہے' گیدڑوں کے ، نہیں! یہ بات کا زخم تھا' تلوار کا نہیں جو بھر جاتا۔ اس نے اپنے دل میں کو ہر قیمت پر ذلیل و رسوا کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

شرزہ خاں نے بانو کی خیر پاتے ہی احمد حسن سے سودا کر لیا تھا۔ اس ز احمد حسن کو یہ جھانسہ بھی دیا تھا کہ میں نئے ابو الحسن تانا شاہ کے بہت ، سابق امرا سے بات کر لی ہے۔ میرے ایک اشارے پر وہ بھی تم سے آ ں گے۔ ایک بار پھر اس خطے میں قطب شاہی حکومت قائم ہو جائے گی اور یں اس حکومت میں بڑا اعلی منصب ملے گا۔ حقیقت یہ تھی کہ اس کی ری باتیں جھوٹ تھیں مگر احمد حسن اس کے فریب میں آ گیا تھا۔ شرزہ ں نے دھوکوں اور زیادتیوں سے اب تک جو کثیر رقم جمع کی تھی' داؤ پر دی تھی۔ یہ رقم اس نے کرائے کے مرہٹہ سپاہیوں پر خرچ کی تھی۔ وہ ، ایک بار اپنے سامنے بانو کو بے بس دیکھنے کا آرزو مند تھا۔ شرزہ خاں عملاً ں فقرے کا جواب دینا چاہتا تھا جو اس کے پیغام کے جواب میں بانو نے کبھی ا تھا۔ وہ بانو کی عزت و آبرو سے کھیلنے کا خواہش مند تھا' یہ جاننے کے جود بھی کہ بانو اب مغل تاجدار شاہ عالم کی بیوی بن چکی ہے۔



پہلے پہل احمد حسن بہت چکرایا کہ اس پیغام کا کیا مقصد ہے جو بانو کو اطاعت گزاری کے اظہار میں بھیجا جا رہا ہے' لیکن جب شرزہ خاں نے اسے اپنے عیارانہ منصوبے سے آگاہ کیا تو وہ کھل اٹھا۔

احمد حسن کے پیغام اطاعت کا وہی اثر ہوا جو شرزہ خاں چاہتا تھا۔ رات کو تمام مغل لشکر اطمینان سے سو گیا۔ وہ جو خود بانو کے خیمے کے محافظ تھے' بے خبر اور غفلت میں تھے۔ بانو ابھی نہیں سوئی تھی حالانکہ نصف سے زیادہ رات گزر چکی تھی۔ اس کا سب وہ طویل خط تھا جو سونے سے پہلے بانو شاہ عالم کو لکھنے بیٹھ گئی تھی۔ وہ اس وقت لکھ رہی تھی۔

"صبح قلعے کے دروازے کھول دیئے جائیں گے اور مغل فوج
....."

وہ ابھی یہیں تک لکھ پائی تھی کہ اسے گھوڑوں کی ٹاپوں کی

آوازیں سنائی دیں۔ لکھتے لکھتے اس کا قلم رک گیا۔ اس نے فوراً پہریداروں کو للکارا۔

"معلوم کرو' یہ گھوڑوں کی ٹاپوں کی اوازیں کدھر سے آ رہی ہیں !"

اس کے خیمے کے در پر جو پہریدار متین تھا' وہ اس وقت اونگھ رہا تھا۔ بانو کی آواز سنتے ہی وہ ایک دم اچھل پڑا۔ اب جو اس نے سامنے نگاہ کی تو سارا عقدہ کھل گیا۔ ہزاروں مشعلوں نے خیمہ گاہ کو گھیر لیا تھا۔ مغل سپاہیوں کے خیموں میں آگ لگائی جا رہی تھی اور انہیں بڑی بیدردی سے قتل کیا جا رہا تھا۔ احمد حسن نے اپنی پوری طاقت سے شب خون مارا تھا۔ چند لمحے پہریدار کے منہ سے کوئی آواز نہ نکل سکی۔ پھر وہ ایک دم سے چیخ اٹھا۔

"حضور ! دغاباز غنیم آ پہنچا۔"

پہریدار کی اس آواز سے چند لمحوں کو بانو کے حواس جاتے رہے' مگر جلد ہی اس نے خود پر قابو پا لیا اور جلدی جلدی مسلح ہونے لگی۔ ابھی وہ ٹھیک طرح اپنے جسم پز ہتھیار نہ سجا پائی تھی کہ اس کے خیمے کو غنیم نے گھیر یہ خبر پاتے ہی ایک بار پھر اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ اسے یقین ہو گیا کہ اب تھوڑی دیر میں وہ گرفتار کر لی جائے گی' مگر اس کے باوجود اس نے دشمن سے جنگ کرنے کا فیصلہ کیا کیونکہ وہ کوئی معمولی عورت نہیں بانو تھی۔ اس نے اسی ماحول میں آنکھ کھولی تھی۔ اس نے زبردست ہمت اور بے مثل استقلال کا ثبوت دیا اور فوراً مسلح ہو کر خیمے سے باہر آ گئی۔

اپنے خیمے سے باہر آ کر بانو نے دیکھا کہ اس کی فوج حالت غفلت میں قتل ہو رہی ہے اور دشمن کے ایک بڑے دستے نے اس کے خیمے کو گھیر لیا ہے۔ گنتی کے چند پہریدار ادھر ادھر مسلح کھڑے تھے مگر ان کے چہروں سے

انتہائی خوف و دہشت کا اظہار ہو رہا تھا۔ ان میں سے ایک نے آگے بڑھ کر بانو کے سامنے گردن خم کی اور بولا۔

"ہر چند کو ہم گنتی میں چند ہیں مگر حضور جان قربان کرنے جا رہے ہیں۔ حق نمک ادا کرنے کا یہی وقت ہے۔ ہم سب کسی بھی طرح یک دم دھاوا ماریں گے اور دشمن کے حصار کو توڑ دیں گے۔ حضور اس موقع سے فائدہ اٹھا کر موت کے اس حصار سے نکل جائیں۔"

وہ سب مغل فرماں روا شاہ عالم کے جاں نثاروں میں سے تھے اور انہوں نے غلط نہیں کہا تھا۔ وہ یقیناً اپنی جانوں کے نذرانے پیش کر دیتے اور بانو کو اس حصار سے نکال دیتے۔ اس وقت بانو سخت خطرے میں تھی۔ اس محاصرے میں اس کا محافظ دستہ بھی کٹ گیا تھا جو پانچ سو جیالے مغلوں پر مشتمل تھا۔ یہ ایسی مصیبت کا وقت تھا کہ کیسا ہی بہادر اور شجاع مخلص ہوتا اسے اپنی جان بچا کر بھاگنا ہی پڑتا' لیکن اس بہادر عورت کی حمیت نے یہ گورا نہیں کیا کہ خود تو بھاگ جائے اور اپنے لشکر کو کٹوا دے۔ اس نے بڑے صبر و تحمل سے پہریداروں کو خیمے کی نگرانی و حفاظت پر مامور کیا اور ان کی پیشکش کو نرمی سے مسترد کر کے اپنا گھوڑا طلب کیا۔

کچھ ہی دیر بعد ہو گھوڑے پر سوار آندھی اور طوفان کی طرح دشمنوں کی طرف بڑھی اور قریب پہنچ کر للکارا۔

"او دغا باز احمد حسن ! تو کہاں ہے ؟ سامنے آ !"

بانو کی للکار سن کر ایک نوجوان سوار نے اپنا گھوڑا آگے بڑھایا۔ یہ نوجوان' احمد حسن کا بڑا بیٹا تھا۔ وہ بڑے گستاخانہ لہجے میں بانو سے مخاطب ہوا۔

"بیگم! آپ محاصرے میں آ چکی ہیں' اور میرا باپ آپ کا سودا بھی

کر چکا ہے‘ لیکن اس کے باوجود ایک راستہ ہے‘ عزت کا راستہ‘ وہ یہ کہ آپ اگر مجھے بجائے اپنے شوہر کے سمجھیں تو ابھی محاصرہ اٹھا لیا جائے۔ یقین کریں کہ یہ آپ کی عزت فزائی ہو گی۔ آپ کے بوڑھے شوہر کی نسبت میں نوجوان ہوں۔ میں اپنے باپ کا جانشین ہوں‘ اس طرح آپ کو قلعہ بھونگیر کی حکومت بھی مل جائے گی۔"

اس گستاخ نوجوان کی زبان سے یہ کلمات سن کر بانو فرط غیظ سے کانپنے لگی۔ پھر اس کی کمان سے تیر نہیں حکم قضا نکلا۔ تیر نے اس نوجان کے سینے کو چھید دیا اور وہ گھوڑے کی پشت سے نیچے آ رہا۔ اسی اثناء میں بانو نے اپنے محافظ دستے کے سردار کو آواز دی۔ وہ دوبارہ آواز دینے والی تھی کہ اسی وقت ایک قیامت خیز شور اٹھا۔ احمد حسن اور شرزہ خاں سواروں کا ایک دستہ لے کر آگے بڑھے اور اس تنہا عورت پر حملہ کر دیا۔ بانو نے شرزہ خاں کو دیکھ لیا تھا جس کا گھوڑا احمد حسن کے پیچھے تھا۔

بانو کی نگاہ غدار شرزہ خاں پر پڑی تو اس کا خون کھول اٹھا۔ اس نے فوراً ہی ترکش سے تیر نکال کر کمان میں جوڑا۔ جانے کیسے شرزہ خاں بھانپ گیا کہ نشانہ وہی ہے وہ اپنے گھوڑے کی پشت پر اوندھا ہو گیا اور تیر سنسناتا ہوا اس کے اوپر سے گزر کر پیچھے آنے والے ایک گھڑسوار کے سینے میں ترازو ہو گیا۔ اسی وقت بانو نے باغی فوج کا ایک دستہ اپنی طرف بڑھتے دیکھا تو گھوڑے کی ایک باگ کھینچ کر کھڑی ہو گئی۔ جب اس نے دیکھا کہ سپاہی اس پر حملہ کرنے سے گریز کر رہے ہیں تو اسے حیرت ہوئی۔ اس کی یہ حیرت لمحاتی تھی کیونکہ وہ ان کا مقصد سمجھ گئی تھی۔ وہ یقیناً سے زندہ گرفتار کرنا چاہتے تھے۔ ایسا نہ ہوتا تو وہ بانو پر تیر برساتے ہوئے حملہ کرتے۔ ایسی صورت میں بانو کا نام و نشان بھی نہ ملتا۔

اس نتیجے پر پہنچ کر بانو خود ان پر حملہ کرنا چاہتی تھی کہ احمد حسن گھوڑا دوڑتا ہوا قریب پہنچ گا اور اس نے اپنے سواروں کو آواز دی۔ اس وقت بانو نے تیزی کے ساتھ اپنا گھوڑا موڑ اور اسے مخالفت سمت میں دوڑا دیا۔ شرزہ خاں جو احمد حسن کے پیچھے ہی تھا‘ بانو کے سپاہیوں نے اسے گھیر لیا تو وہ چیخ اٹھا۔

"بہادرو! ادھر آؤ دشمن نے مجھے گھیر لیا ہے۔"

احمد حسن‘ بانو کے تعاقب میں جانے کی بجائے ایک دم پلٹا اور اس کے سپاہیوں نے بھی رخ بدل لیا۔ ان کا واپس پھرنا تھا کہ بانو نے عقب سے باغی فوج پر حملہ کر دیا۔ اس نے پر رعب آواز میں چیخ کر کہا۔

"او فریبیو! ہوشیار ہو جاؤ۔ تمہارے دھوکے اور فریب کا نتیجہ ابھی ظاہر ہوا جاتا ہے۔ دیکھو میری مدد کے لیے اور بھی فوج پہنچ گئی ہے۔"

وہ لمحے انتہائی جوش انگیز تھے۔ ادھر تو احمد حسن کی فوج میں اضطراب اور پریشانی پھیل گئی ادھر بانو کے سپاہی سب طرف سے سمٹ سمٹا کر دشمن پر جھپٹ پڑے بانو نہایت دلیری اور جرات سے دشمن کے لشکر میں گھس گئی‘ مگر جس چہرے کو دیکھ کر اس نے یہ خطرناک قدم اٹھایا تھا‘ وہ چہرہ نہ جانے کدھر غائب ہو گیا تھا! شرزہ خاں‘ بانو کی تلوار کی کاٹ سے اچھی طرح واقف تھا اس لیے اس کی نظروں کے سامنے سے ہٹ گیا تھا۔

بانو کے اس دلیرانہ اقدام کا یہ فائدہ ہوا کہ دشمنوں کا غول چھٹ گیا اور گھمسان کی لڑائی ہونے لگی۔ صبح تک برابر جنگ جا رہی۔ اس وقت تک بانو زخموں سے چور چور ہو چکی تھی شدید زخمی ہونے کی وجہ سے وہ محاصرہ اٹھانے پر مجبور ہو گئی۔ اس نے فوج کو وہاں سے کوچ کا حکم دیا اور پھر گنہ کلپاک پہنچ کر دم لیا۔

پرگنہ کلپاک میں بانو نے اپنے زخموں کا علاج کرایا اور سخت تکلیف اٹھانے کے بعد چند روز میں صحت یاب ہو گئی۔ اگرچہ اس شب خون میں بانو کے تقریباً ساڑھے تین ہزار سپاہی کام آئے تھے مگر اس کے پاس کافی سامان رسد بھی موجود تھا۔ اس نے دوبارہ اسی لیے قلعہ بھونگیر کا قصد کیا۔ شرزہ خاں اس کی نقل و حرکت پر نظر رکھے ہوئے تھا اس لیے دوبارہ محاصرہ کی نوبت نہ آسکی قلعہ بھونگیر سے چھ سات میل پہلے ہی دشمن نے بانو کے لشکر پر حملہ کر دیا۔ مغلوں نے تلواریں علم کر لیں۔ کلپاک سے روانہ ہوتے وقت فوج کے سالاروں نے بانو سے درخواست کی تھی کہ کچھ بھی ہو جائے' آپ اپنی زندگی خطرے میں نہ ڈالیے ورنہ ہم بادشاہ محترم کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں گے۔ اس کے علاوہ یہ کہ موجودہ صورت حال میں پہلے ہی کی طرح پسپائی اختیار کرنا پڑے گی۔

بانو نے مغل سرداروں کی اس معقول درخواست کو قبول کر لیا۔ انہوں نے بڑی مناسب دلیل سے بانو کو قائل کر دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس بار خواہش کے باوجود بانو نے اپنے دل کو مار لیا۔ وہ لڑی تو سہی مگر تنہا نہیں لڑی۔ اس کے ارد گرد جاں نثار مغلوں کا مضبوط گھیرا تھا جسے توڑنا کوئی ہنسی کھیل نہیں تھا۔ وہ سبھی ازمودہ کار سپاہی تھے۔ اس محتاط اقدار کا یہ نتیجہ ہوا کہ لڑائی طول کھینچ گئی۔ مکمل دس روز تک بڑے زور شور سے جنگ ہوتی رہی۔ اس دوران میں کئی ایسے مواقع آئے کہ شرزہ خاں کو اس نے لڑتے دیکھا مگر وہ "آناً فاناً" میں غائب ہو جاتا۔ شرزہ خاں خوب سمجھتا تھا کہ ایک بار بھی وہ بانو کے مقابل آگیا تو پھر نہ بچ سکے گا اسی لیے وہ پوری طرح چوکنا تھا۔ جیسے ہی اسے ذرا شک ہوتا کہ بانو کہیں قریب موجود ہے' وہ وہاں سے دور ہو جاتا' مگر احمد حسن اتنا چالاک ثابت نہ ہوا۔ وہ بانو کے ہتھے چڑھ

گیا۔۔ عین میدان جنگ میں وہ بانو کے ہاتھوں قتل ہوا۔ ایک مغل سردار نے لپک کر اس کا سر کاٹ لیا اور نیزے پر چڑھا دیا۔

○-------○-------○

احمد حسن کے قتل ہوتے ہی دشمن فوج کے پاؤں اکھڑ گئے۔ شرزہ خاں نے لاکھ چاہا کہ احمد حسن کی فوج مقابلے پر ڈٹی رہے مگر ایسا نہ ہو سکا اور گیارہویں دن بانو نے قلعہ فتح کر لیا۔ احمد حسن کی بیوی اور بچوں کو زندہ گرفتار کر لیا گیا۔ بانو نے ان کے ساتھ رحمدلانہ برتاؤ کیا۔ اب اسے شرزہ خاں کی تلاش تھی۔ احمد حسن کی فوج تتر بتر ہو کر فرار ہو گئی تھی مگر شرزہ خاں کو فرار کا موقع نہ مل سکا تھا۔ جن چند سو سپاہیوں کو گرفتار کیا گیا تھا ان میں شرزہ خاں بھی تھا۔ بانو نے اسے لیے جنگی قیدیوں کے معائینے کا حکم دیا تھا۔ مغل سپاہی یہ سمجھ رہے تھے کہ شاید معائینے کے بعد بانو ان سب کو قتل کر دینے کا حکم دے دے گی۔ اس نے ابھی تک کسی کو یہ نہیں بتایا تھا کہ اس معائینے کا مقصد مغل بادشاہوں کی تقلید نہیں' کچھ اور ہے۔

ہر چند کے شرزہ خاں نے اس سے منہ چھپانے کی کوشش کی مگر

اسے تو بانو ہزاروں میں الگ پہچان سکتی تھی۔ پھر وہ کیسے بانو کی نگاہ سے بچ جاتا اس نے مغل سپاہیوں کو اشارہ کیا اور انہوں نے شرزہ خاں کو دوسرے قیدیوں کے درمیان سے باہر گھسیٹ لیا۔ اس وقت بانو نے ان تمام جنگی قیدیوں کی جاں بخشی کا حکم سنا دیا' مگر ان میں شرزہ خاں شامل نہیں تھا۔ بانو اب آستین کے اس سانپ کو زندہ چھوڑنا نہیں چاہتی تھی' لیکن اس سے پہلے وہ حقیقت حال جاننا چاہتی تھی کیونکہ ابھی تک وہ لا علم تھی کہ شرزہ خاں کیوں اور کیسے بھونگیر پہنچ گیا تھا!

طوطے کی چونچ کی طرح خم کھائی ہوئی ناک اور الوؤں ایسی گول آنکھوں والا شرزہ خاں سمجھ چکا تھا کہ موت سامنے ہے۔ یہی وجہ تھی کہ جب اس کے ہاتھ پشت پر باندھ کر اسے بانو کے سامنے پیش کیا گیا تو وہ بانو کے قدموں میں گر گیا اور اپنا سر اس کے پیروں میں رکھ کر رونے لگا۔ بانو کے اشارے پر سپاہیوں نے آگے بڑھ کر اسے بانو کے قدموں سے اٹھا لیا۔۔ بانو کے ہاتھ میں اس وقت شمشیر برہنہ تھی۔

"ابھی تیری زندگی کا چراغ گل ہونے میں کچھ ساعتیں باقی ہیں۔"

بانو گرجی۔

"اس لیے ہمیں بتا کہ تو یہاں کیسے آ گیا؟"

شرزہ خاں نے سب کچھ بتا دیا۔ اس نے یہ اعتراف بھی کر لیا کہ وہ بانو کو انتقاماً" قتل کر دینا چاہتا تھا' لیکن اصل بات وہ چھپا گیا۔ اس نے انتقام کا سبب اپنی اس ذلت اور شکست کو بتایا جو اسے بانو کے ہاتھوں اٹھانا پڑی تھی۔ اعتراف جرم کرنے کے بعد وہ بڑے رقت آمیز لہجے میں گڑگڑایا۔

"اے رحم دل خاتون' میں اپنی خطاؤں پر انتہائی شرمندہ اور نادم ہوں۔ میں بطور کفارہ اپنی بقیہ زندگی تیری خدمت میں گزار دینا چاہتا ہوں۔

کیا تو میری التجا قبول نہ کرے گی!"

بانو کا دل پسیج گیا اور اسے وہ وقت یاد آ گیا جب اسے اورنگ زیب عالمگیر کے سامنے ایک جنگی قیدی کی حیثیت سے پیش کیا گیا تھا۔ اس نے اپنی تلوار نیام میں ڈال لی اور شرزہ خاں کی طرف سے منہ پھیر کر بولی۔

"تو اس قابل نہیں کہ ہم تجھے اپنی خدمت میں رکھیں البتہ ہم تیرا خون معاف کرتے ہیں۔"

"مگر مجھے اماں کہاں ملے گی؟"

شہزادہ اعظم شاہ کے رفیقوں میں تو میں بھی تھا۔ شرزہ خاں فوراً ہی بول اٹھا۔

"تیرے قصور معاف کر دیئے جائیں گے۔ ہم تجھے اپنے دست خاص سے معافی نامہ لکھ کر دیں گے۔"

پھر وہی ہوا جو بانو نے کہا تھا۔ شاہ عالم نے اسے اس کے منصب پر بحال کر دیا۔ شاہ عالم بھلا بانو کی بات کس طرح ٹال سکتا تھا۔ اسی دوران میں شاہ عالم کو یہ علم ہو چکا تھا کہ دکن میں دوبارہ قطب شاہی حکومت کے قیام کی خبریں بے بنیاد تھیں۔ بانو قلعہ بھونگیر کو اپنے ایک معتبر فوجی افسر کی تحویل میں دے کر شاہ عالم کے پاس پہنچ چکی تھی جو اس وقت پنجاب کی طرف بڑھ رہا تھا۔ پنجاب سے فتنہ و فساد کی خبریں آ رہی تھیں جنہیں سن کر شاہ عالم نے ادھر کا قصد کیا تھا۔ پنجاب کا فتنہ و فساد کو فرو کرنے کے بعد شاہ عالم نے لاہور میں زبردست جشن کا بندوبست کیا۔ یہ جشن بانو کی فتح یابی کے سلسلے میں تھا۔ شاہ عالم کا عقد میں آنے کے بعد بانو پہلی بار تن تنہا کسی مہم سے فتح یاب ہوئی تھی۔

اس کے بعد شاہ عالم جب تک زندہ رہا' بانو ہر خطرناک مقام پر

اسلحہ سے آراستہ ہو کر اس کے ساتھ رہی اور میدان جنگ میں شجاعت کے حیرت انگیز جوہر دکھائے۔

بانو زرہ بکتر بنانا خوب جانتی تھی۔ شاہ عالم جس قدر زرہ بکتر معرکہ آرائی کے وقت استعمال میں لاتا تھا' وہ سب بانو ہی کے ہاتھ کی بنی ہوتی تھیں۔

محرم ۱۲۲۱ھ کے آخری عشرے میں جبکہ شاہ عالم کی عمر ستر سال سے زیادہ ہو گئی تھی' وہ سخت بیمار پڑ گیا اور ایسا بیمار پڑا کہ پھر اٹھ نہ سکا۔ روز بروز اس کی حالت بگڑتی ہی گئی۔ بانو شب و روز اس کی خدمت میں مستعد رہی۔ ایک روز شاہ عالم کی حالت زیادہ بگڑی تو بانو نے اس سے رقت آمیز لہجے میں کہا۔

"میرے لیے کیا ارشاد ہے؟"

شاہ عالم اس وقت جاں کنی کے عالم میں تھا۔ اس لیے بانو کی بات کا فوراً کوئی جواب نہ دے سکا' لیکن جلد ہی اس نے حواس مجتمع کر کے بہ مشکل کہا۔

"بانو! میں اپنی زندگی ہی میں حکم دیتا ہوں کہ میرے انتقال کے بعد تم تخت نشین ہو جاؤ۔"

بانو تقریباً چیخ اٹھی۔

"حضور؟ کنیز کا یہ مقصد ہرگز نہیں تھا۔ کنیز تو حضور کا کوئی ایسا حکم سننے کی منتظر تھی کہ اسے خدمت کی سعادت نصیب ہو جائے گی۔"

مگر شاہ عالم پر پھر غفلت طاری ہو گئی۔ پھر وہ اسی عالم بے ہوشی میں راہ فنا پر گامزن ہو گیا۔ اسے حضرت قطب الدینؒ کے روضے کے قریب دارالخلافہ سے چار پانچ کوس کے فاصلے پر دفن کیا گیا۔

شاہ عالم کے انتقال کے بعد بانو کی نظر میں دنیا ہیچ ہو گئی تھی۔ اب نہ اسے اقتدار حکومت سے کوئی دلچسپی رہ گئی تھی نہ جاہ و حشم سے ! یہی سبب تھا کہ جب تخت تاج کے لیے کشت و خون ہونے لگا تو بانو نے اس میں کوئی حصہ نہ لیا اور پھر اس کا سوتیلا بیٹا جہاں دار شاہ تخت نشین ہو گیا۔ بانو اس کے حق میں تخت حکومت سے پہلے ہی دستبردار ہو چکی تھی۔ اب وہ اپنی زندگی کا بقیہ حصہ سکون کے ساتھ گوشہ نشینی میں بسر کر دینا چاہتی تھی۔

بانو کے یہاں شاہ عالم سے کئی بچے ہوئے لیکن وہ سب کے سب شیر خواری کی حالت میں مر گئے۔ کوئی اولاد نہ تھی جس سے بانو کا دل بہلتا۔ وہ اب اپنے ساتھ بہت سا زر و جواہر لے کر دہلی سے لاہور آ گئی۔ یہ تمام زر و جواہر اسی کی ملکیت تھا۔ بانو دانستہ دہلی سے دور رہنا چاہتی تھی تاکہ محلاتی سازشوں کا سایہ بھی اس پر نہ پڑ سکے۔ لاہور آنے کے بعد شب و روز کتب بینی اور کتاب کی تالیف کے سوا بانو کا کوئی مشغلہ نہ تھا۔ شہر لاہور کے خوش نما منظر اور اس کی آب و ہوا بانو کو بہت بھلی لگی تھی۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنی حیات مستعار کا بقیہ حصہ لاہور ہی میں گزار دے گی۔ اسی خیال سے اس نے اپنے لیے ایک شاندار اور خوش نما عمارت تیار کرائی۔ انہی دنوں اسے ایک عجیب خبر ملی کہ اس کا دشمن جانی شرزہ خاں' مغل فرمان روا جہاں دار شاہ کے دربار میں ایک اعلیٰ منصب حاصل کر چکا ہے۔

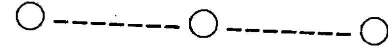
اپنے عیار اور کینہ پرور دشمن کو بانو نے بھلا دیا تھا مگر وہ بانو کو نہیں بھولا تھا۔ اب بھی اس کے سینے میں انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی۔ شاہ عالم کی زندگی میں اسے کبھی یہ حوصلہ نہ ہوا کہ بانو کے خلاف کوئی سازش کر سکے لیکن اب گویا اس کے لیے راستہ صاف تھا۔ شرزہ خاں نے اپنے ناپاک مقاصد حاصل کرنے کے لیے اور جہاں دار شاہ کی نظر میں اپنی توقیر بڑھانے

کی خاطر دکن کے کچھ ایسے علاقے جو مرہٹوں کے قبضے میں چلے گئے تھے۔ ساز باز کر کے دوبارہ جہاں دار شاہ کو ان پر بظاہر قابض کرایا۔ عملاً اب بھی وہاں کے کرتا دھرتا مرہٹہ سردار ہی تھے۔ اس طرح شرزہ خاں نے ایک تیر سے دو شکار کھیلے تھے۔ ایک طرف تو اب مرہٹوں کو مغل بادشاہ کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں رہا تھا' دوسری جانب شرزہ خان' بادشاہ کی نظر میں چڑھ گیا تھا۔ مغل بادشاہ سے اس نے انہیں مرہٹہ سرداروں کو ان علاقوں کے مختلف اہم عہدے دلوا دیئے تھے۔ شرزہ خاں کی اس عیاری کا اسے یہ صلا ملا کہ مغل دربار میں اسے پہلی صف میں جگہ مل گئی۔

ان دنوں بانو ایک کتاب "مغل خواتین" کی تالیف میں مصروف تھی۔ شرزہ خاں کے متعلق ملنے والی اطلاعات نے اسے سخت فکر مند کر دیا تھا۔ اب اسے اپنا ہی کہا ہوا ایک عربی شعر بار بار یاد آتا تھا۔ اس شعر کا مفہوم کچھ یوں تھا کہ اپنے دشمن کو زندہ چھوڑ کر اپنی ہی عمر کم نہ کر! تو اگر اسے جینے دے گا تو پھر وہ تجھے نہ جینے دے گا۔

ادھر شرزہ خاں نے جہاں دار شاہ کو یہ پٹی پڑھانا شروع کر دی کہ بانو کی زندگی اس کے اقتدار حکومت کے لیے زبردست خطرہ ہے۔ وجہ اس نے وہی بیان کی شاہ عالم نے بانو کو اپنا جانشین بنایا تھا۔ شرزرہ خان یہ بھی کہا کہ بانو زندہ رہی تو کسی بھی وقت کوئی فتنہ کھڑا ہو سکتا ہے۔ بانو کو گرفتار کر کے قتل کرنے کی ذمہ داری شرزہ خاں نے خود لے لی۔ اس طرح شرزہ خاں اپنے اس ناپاک ارادے کی تکمیل چاہتا تھا جس کے لیے اس نے بڑا صبر کیا تھا۔ وہ بانو کو اپنے سامنے بے بس دیکھنا چاہتا تھا اور اس بات کا عملی جواب دینے کا خواہش مند تھا کہ شیرنی صرف شیروں کے لیے پیدا ہوتی ہے' گیدڑوں کے لیے نہیں۔ اس نے سوچا تھا کہ بانو کو قتل کرنے سے پہلے بے

آبرو ضرور کرے گا۔ شرزہ خان کی باتیں جہاں دار شاہ کے دل کو لگتی تو تھیں اور وہ دل سے اس پر راضی بھی تھا کہ بانو کو قتل کر دیا جائے مگر ڈرتا بھی تھا۔ اب بھی مغل فوج میں بانو کی بڑی عزت تھی۔ مغل اپنے مرحوم بادشاہ کی بیوہ' پر شاید ہتھیار نہ اٹھاتے اور سارا معاملہ ہی الٹا ہو جاتا۔ اس کی دانست میں یہ آگ سے کھیلنے کے مترادف تھا۔ اس نے شرزہ خاں کو یہ کہہ کر ٹال دیا کہ براہ راست کوئی اقدام کرنے کی بجائے وہ کوئی اور تجویز پیش کرے۔



جانے کس طرح بانو کے وفاداروں کو بھی اس سازش کی خبر ہو گئی۔ وہ خود بھی جہاں دار شاہ سے تنگ تھے جو ایک طوائف لعل کنور کے عشق میں مغل بادشاہوں کی عزت و وقار پامال کر رہا تھا۔ نااہل لوگ جہاں دارا شاہ کی نظر میں اہل ٹھہرے تھے' اہل اور وفادار افراد کی وفاداریاں جہاں دار شاہ کے نزدیک مشتبہ تھیں۔ مغل فوج کے یہ وہ معتوب مگر با اثر سردار تھے جو اپنے مرحوم بادشاہ شاہ عالم کی وصیت پوری کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے بانو کے پاس پے در پے بہت سی عرضیاں بھیجیں کہ اگر آپ اس طرف تشریف لانے کا ارادہ کریں تو ہم جہاں دار شاہ کو قتل کر کے مرحوم بادشاہ کی وصیت کے مطابق آپ کو سلطانہ بنائیں' مگر بانو نے سلطنت کی پرواہ نہ کی۔

شرزہ خاں نے کچھ دن جہاں دار شاہ کے دربار میں رہ کر اندازہ لگا لیا کہ وہ اگر بانو کے بارے میں کوئی قدم اپنے طور پر اٹھائے گا تو جہاں دار شاہ

چشم پوشی سے کام لے گا۔ ایک روز اس نے جہاں دار شاہ سے کہا۔

"حضور عالی! میں نے بانو کو ختم کرنے کی تدبیر سوچ لی ہے۔ اس سے حضور کے دامن پر دھبہ نہیں آئے گا۔ اسے ختم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے اس کے عزت و وقار کو خاک میں ملا دیا جائے۔ لوگوں کے دلوں میں اس کی جو توقیر ہے ختم ہو جائے گی تو پھر اس کے قتل پر واویلا نہ کریں گے۔"

جہاں دار شاہ نے دبی زبان میں اس تجویز پر رضا مندی ظاہر کر دی۔ شرزہ خاں اپنے ہمراہ بہت سے مفسدوں اور افواہ طرازوں کو لے کر لاہور پہنچ گیا۔

بانو نے جس طرح شاہ عالم کی زندگی میں پردہ نہیں کیا' اسی طرح وہ اب بھی آزادی کے ساتھ باغوں' جنگلوں اور بازاروں میں گھوڑے پر سوار ہو کر سیر کرتی پھرتی تھی۔ شرزہ خاں اور اس کے افواہ طرازوں نے اسی سے فائدہ اٹھایا۔ انہوں نے بانو کے متعلق لغو اور بے بنیاد عشقیہ افسانے مشہور کر دیئے۔ انہی افسانوں میں خود شرزہ خاں نے بانو سے اپنے جھوٹے عشق کا افسانہ بھی مشہور کر دیا۔ اس افسانے کا لب لباب یہ تھا کہ بانو اب بھی اسے چاہتی ہے اور رشتہ محبت استوار کرنے کی متمنی ہے مگر وہ مرحوم بادشاہ کی بیوہ سے ایسے مراسم رکھ کر مغلوں کی بدنامی نہیں چاہتا۔

ایسی نفرت انگیزی اور رسوا کن خبروں نے بانو کو لاہور چھوڑنے پر مجبور کر دیا اور وہ ملتان چلی گئی۔ شرزہ خاں نے اسے ملتان میں بھی چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ انجام کار وہ ملتان میں بھی نہیں ٹھہری اور سیدھی حیدر آباد دکن روانہ ہو گئی جو اس کا وطن بھی تھا۔ دکن پہنچ کر اسے شرزہ خاں کے شر سے کچھ عرصے کے لیے نجات مل گئی۔

حیدر آباد میں بانو جس عالی شان قصر میں رہتی تھی' وہ کسی مضبوط قلعے ہی کی طرح تھا۔ ایسا نہ تھا کہ بانو کسی سے خوف زدہ تھی بلکہ اسے جلد از جلد اپنی کتاب "مغل خواتین" ختم کرنے کی خاطر سکون و آرام کی ضرورت تھی۔ اب وہ اپنے قصر سے کم ہی نکلتی تھی۔ قصر کی حفاظت کا بھی اس نے معقول بندوبست کیا تھا۔ اس کے دیرینہ خدام حیدر آباد میں بھی ساتھ تھے۔ یہ خدام بظاہر تو پہریدار تھے لیکن ان میں سے ہر ایک بلا کا جری تھا۔ وہ بانو کی جنبش ابرو پر اپنے سر کٹا سکتے تھے۔ بانو کو ان پر مکمل اعتماد تھا۔ ان خدام کی موجودگی میں مجال نہ تھی کہ کوئی پرندہ وہاں پر مار سکتا۔ اس کے علاوہ بانو نے قصر کی حفاظت کے لیے ایسا بندوبست کیا تھا کہ لوگ اس طرف آتے ہوئے بھی خوف کھاتے تھے۔ قصر کے اطراف بانو نے گہری اور ناقابل عبور خندق کھدوائی تھی۔ اس خندق میں پانی بھرا رہتا تھا اور پانی کے اندر بھوکے مگرمچھ تیرتے رہتے تھے۔ ان مگرمچھوں کو دانستہ کم خوراک دی جاتی تھی۔ بندوبست ایسا تھا کہ مگرمچھ خندق سے نکل نہ سکتے تھے۔ پانی کی سطح خندق کے کناروں سے خاصی نیچی رکھی جاتی تھی۔ قصر میں داخل ہونے کے لیے صدر دروازے پر ایک تختہ تھا جسے رات کے وقت اٹھا دیا جاتا تھا۔ اسے عبور کر کے ہی قصر میں داخلہ ممکن تھا۔

شرزہ خاں جب بانو کو تلاش کرتا ہوا حیدر آباد پہنچا تو قصر سے متعلق تمام تفصیلات اس کے علم میں آ گئیں۔ شرزہ خاں اب دیکھنے میں کوئی بوڑھا گدھ معلوم ہوتا تھا۔ ساری زندگی اس نے اسی عورت کے پیچھے بھاگتے ہوئے گنوا دی تھی جو اس قصر میں سکونت پذیر تھی۔ اس کے ہمراہ بڑے خوں خوار لوگ تھے جنہیں اس نے کثیر دولت خرچ کر کے اپنا مطیع بنا لیا تھا۔ ان کی تعداد پچاس سے زیادہ تھی۔ شرزہ خاں ان لوگوں کے ذریعے بانو کو

اغوا کرانے کا خواب دیکھتا ہوا حیدر آباد پہنچا تھا مگر یہاں آنے اور قصر کے متعلق جاننے کے بعد ان خون خواروں کا پتہ بھی پانی ہو گیا تھا۔

ان دنوں بانو نے قصر سے نکلنا تقریباً چھوڑ ہی دیا تھا۔ اب وہ "مغل خواتین" نامی کتاب لکھنے کے بعد اپنی زندگی کے حالات و واقعات قلم بند کر رہی تھی۔ وہ باہر کی دنیا سے تقریباً کٹ سی گئی تھی اس لیے اسے حیدر آباد میں شرزہ خاں کی آمد کا کچھ علم نہ ہو سکا۔

کچھ دن تک شرزہ خاں بڑے سکون و صبر کے ساتھ بانو کے قصر سے نکلنے کا انتظار کرتا رہا مگر جلد ہی اسے بیزاری ہونے لگی۔ وہ ان لوگوں سے بھی تنگ تھا جنہیں اپنے ساتھ حیدر آباد لایا تھا۔ انہوں نے قصر میں داخل ہونے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ شرزہ خاں نے مجبوراً نہیں واپس کر دیا۔ اس وقت وہ بڑبڑا رہا تھا۔

"آخر کار آدمی کو اپنی جنگ خود ہی لڑنا پڑتی ہے۔"



نصف شب گذر چکی تھی مگر بانو کے ہاتھ میں اب بھی قلم تھا۔ وہ روانی سے لکھے جا رہی تھی کہ خلاف توقع ایک معمولی سی آہٹ سن کر وہ چونک اٹھی۔ اس کا ایک خادم خلوت میں آتا دکھائی دیا۔ یہ اسی کے قدموں کی چاپ تھی جسے سن کر بانو ایک دم مڑی تھی۔ اس کے خدام کو بغیر طلبی اس کی خلوت میں آنے کی اجازت نہ تھی اس لیے وہ حیران ہوئی، مگر اس نے نرمی سے خادم کو مخاطب کیا اور ناواقف آمد کا سبب پوچھا۔

خادم ادب سے جھکا، پھر پرسکون آواز میں بولا۔

"حضور! وہ کوئی جنونی بوڑھا معلوم ہوتا ہے جو قصر میں داخل ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔"

بانو نے ہاتھ سے قلم رکھ دیا اور خادم سے تفصیلات طلب کیں۔

خادم نے بدستور پرسکون آواز میں بتایا۔

"وہ شروع ہی سے ہماری نظر میں تھا۔ اس نے بڑے ماہرانے انداز میں قصر کے کنگورے پر کمند ڈالی اور پھر اس کے ذریعے خندق پار کر لی۔ ایسا کرتے ہوئے وہ بھوکے مگرمچھوں کی خوارک بنتے بنتے بچا۔ اب وہ بہت آہستہ آہستہ کمند کی رسی کے سہارے اوپر آ رہا ہے۔ خدام، حضور کے حکم کا انتظار کر رہے ہیں۔ حکم ہو تو رسی کاٹ دی جائے!"

"اس بوڑھے کا حلیہ بیان کرو! کیا تم میں سے کسی نے اس کی صورت دیکھی ہے؟" بانو نے دریافت کیا۔

"جی ہاں حضور!"

خادم نے جواب دیا۔

"سبھی نے اس کا چہرہ دیکھا ہے۔ اس وقت جب وہ کمند ڈال رہا تھا، اس کے ہاتھ میں مشعل تھی۔ وہ واقعی کوئی جنونی ہی لگتا ہے کیونکہ کمند کے ذریعے اس کی واپسی ممکن نہیں ہے۔"

پھر خادم کو خیال آگیا کہ اس سے حلیہ پوچھا گیا ہے۔ وہ جلدی سے بولا۔

"حضور! اس بوڑھے کی ناک کسی طوطے کی چونچ کی مانند مڑی ہوئی اور آنکھیں گول ہیں جو اندر کو دھنسی ہوئی ہیں مگر چمک دار اور بالکل الوؤں کی سی ہیں اور....."

"اس کے جبڑے بھاری ہیں اور وہ کوتاہ قامت ہے۔"

خادم کی بات کاٹ کر بانو ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی۔

خادم سٹپٹا کر بولا۔

"جی..... جی ہاں حضور! اس کا یہی حلیہ....."

"ٹھیک ہے۔ جاؤ ہم خود آ رہے ہیں۔"

بانو نے خادم کو حکم دیا۔ "ہمارے آنے سے پہلے اسے اوپر نہ چڑھنے دیا جائے! اسے یہ بھی بتا دیا جائے کہ نیچے خندق میں بھوکے مگرمچھ اس کی ضیافت کے منتظر ہیں۔ ہم نہیں چاہتے کہ ہمارے وہاں پہنچنے سے پہلے وہ لقمہ اجل بن جائے۔"

خادم یہ حکم سنتے ہی دوڑ گیا۔ پہلے وہ یوں پرسکون اور مطمئن تھا کہ وہ جنونی بوڑھا اگر اوپر آ بھی جاتا تو اسے گرفتار کر لیا جاتا لیکن اب تو بانو نے اور ہی حکم دیا تھا۔

بانو کے جسم پر اس وقت مردانہ لباس نہیں تھا۔ وہ اب اسی وقت مردانہ لباس پہنتی تھی جب قصر سے باہر نکلنا ہوتا تھا۔ اس نے انتہائی سرعت کے ساتھ مردانہ لباس پہنا، پھر ہتھیاروں سے آراستہ ہوئی، اس کے بعد تیز تیز قدم اٹھاتی اپنی خلوت گاہ سے نکل گئی۔ وہ بہت جلد قصر کی چھت پر پہنچ گئی اور خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑائی۔

"ظالم کی رسی بہت دراز کر دی گئی تھی مگر آج کھینچ لی گئی۔"

خدام نے بانو کو آتے دیکھا تو باادب ہو گئے۔ انہوں نے اس جنونی بوڑھے کو اب تک اوپر نہیں آنے دیا تھا۔ بوڑھا خوف زدہ آواز میں چیخ رہا تھا۔

"ارے ظالمو! کچھ تو خوف خدا کرو، مجھے اوپر آ جانے دو!..... اوپر آ جانے دو ورنہ میرے ہاتھ سے رسی چھوٹ جائے گی۔ تمہیں خدا اور اس کے رسولؐ کا واسطہ....."

معاً" بانو آگے بڑھی خدام ادھر ادھر ہوگئے۔ وہ کسی قدر جھک کر

نہایت نرمی سے بولی۔

"شرزہ خاں! یہ تم ہو؟"

جواب میں بوڑھا چیخ اٹھا

"ہاں... ہاں میں ہوں.... تمھارا خادم شرزہ خاں۔"

"ہاں ہاں میں کچھ پہچان رہی ہوں تمہیں۔"

بانو کا لہجہ بڑا عجیب سا تھا۔

کہیں تم وہی شرزہ خاں تو نہیں جو قطب الملک ابوالحسن تانا شاہ کا کمان دار تھا؟... وہ شرزہ خاں جو مغل بادشاہ جہاں دارا شاہ کے دربار میں اعلیٰ منصب پر فائز ہے۔"

"میں ..... میں وہی ہوں ..... وہی ! ٹھیک پہچانا تم نے ! مگر مجھے اوپر تو آنے دو اے مہربان خاتون !"

"لیکن میرے تعلقات تو شرزہ خاں نامی کئی لوگوں سے ہیں اس لیے پہلے مکمل شناخت ضروری ہے۔ کیا تم وہی شرزہ خاں ہو جس نے ایک کنواری دوشیزہ بانو کے پاک دامن پر ہوس کا داغ لگانا چاہا تھا؟ جواب دو ورنہ تمہیں اوپر نہیں آنے دوں گی۔

"میں ..... میں وہی گناہ گار ہوں لیکن اب ..... ہر گناہ سے توبہ کر چکا ہوں اور ..... اور توبہ تو خدا بھی قبول کر لیتا ہے۔"

"نہیں !"

بانو کے لہجے میں ایک دم سختی آ گئی۔

"ابھی تمہاری مکمل شناخت نہیں ہو سکی۔"

اسی طرح بانو از اول تا آخر شرزہ خاں سے اس کے ایک ایک جرم کا اعتراف کراتی رہی۔ مجبوراً شرزہ خاں اپنے ہر جرم کا اقرار کرتا رہا اور برابر یہ التجا کرتا رہا کہ اسے قصر کی چھت پر آنے کی اجازت دے دی جائے۔

پہلے بانو کا کچھ اور ہی خیال تھا۔ اسی خیال سے وہ ہتھیار سجا کر آئی تھی، مگر اب اسے یہ بچکانہ سی خواہش معلوم ہوئی کہ شرزہ خاں سے وہ آخری مقابلہ کرے اور اسے جان بچانے کا موقع دے۔وہ بڑبڑائی۔

"یہ خودنمائی کا جذبہ ہے اور مجھے اب اس کی ضرورت نہیں۔" پھر اس نے بہ آواز بلند شرزہ خاں کو مخاطب کیا۔

"شرزہ خاں ! جب تمہیں اپنے تمام گناہوں کا اقرار ہے تو پھر زندہ رہنے پر اس قدر بہ ضد کیوں ہوا؟"

اس عیار نے اپنی خصلت و عادت کے مطابق پھر خدا اور رسولؐ کا واسطہ دیا۔

"خاموش ہو جاؤ !"

بانو طیش کے عالم میں چیخ اٹھی۔

"تمہاری ناپاک زبان پہ یہ محترم و مقدس نام اب آئے تو میں....."

وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

"میں اب ..... کسی کا واسطہ نہیں دوں گا، مگر ..... مگر میرے ہاتھ پھسلنے لگے ہیں ..... میں ..... میں اب اوپر آنے سے نہیں رک سکتا !"

شرزہ خاں کی قوت ارادی اب جواب دے گئی تھی۔ جس کے بل پر وہ اب تک لٹکا رہا تھا۔ بانو نے اسے اوپر چڑھتے دیکھا اور اپنی پیٹی سے خنجر نکال کر رسی کاٹ دی۔ شدید صدمے اور خوف کے سبب شرزہ خاں چیخ بھی نہ سکا۔ چھپاک کی آواز ہوئی اور خندق میں تیرتے ہوئے بھوکے مگرمچھ بوڑھے شرزہ خاں کے جسم پر ٹوٹ پڑے۔ انھوں نے لمحوں میں شرزہ خاں

کے جسم کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور سارا گوشت کھا گئے۔ اب وہ ہڈیاں توڑ توڑ کر کھا رہے تھے۔ ان دہشت ناک آوازوں کو سن کر بانو بھی ایک بار کانپ کر رہ گئی۔ شرزہ خاں کا انجام بہت بھیانک ہوا تھا۔

ختم شد